منزلِ شب

منزلِ شب

نیا ادارہ

سرورق اور زیبایش ٭ حنیف رامے

مختار صدیقی

منزل شب

جملہ حقوق محفوظ

بار اول - ۱۹۵۵ء

تعداد اشاعت : ۱۱۰۰

طابع و ناشر : نذیر احمد چودھری

سویرا آرٹ پریس ، لاھور

ترتیب

بشنو از نے ، ۹

شب تاب

رات کی بات ، ۱۹
سکھ میں دکھ ، ۲۱
رسوائی ، ۲۳
ھرجائی ، ۲۵
ترے جلوے تیرے حجاب کو مری حیرتوں سے نمو ملی ، ۲۶
آتش دان کا بت ، ۲۷
زوال ، ۲۹
اناؤنسر ، ۳۱
درد شرمندۂ درماں نہ سہی ، ۳۲
موت کو زیست ترستی ھے یہاں ، ۳۳
ایک تمثیل ، ۳۴
قبر میں پہلی رات ، ۳۶
برزخ ، ۳۷
اب دکھ سے ھوا نباہ اپنا ، ۳۹
نور سحر کہاں ھے اگر شام غم گئی ، ۴۰
آخری بات ، ۴۱
وقفہ ، ۴۴
کیسی یادوں سے کہوں ، ۴۵
بازیافتہ ، ۴۶
کیسے کیسے لوگ ، ۴۷
قریۂ ویراں ، ۴۹
منزل شب ، ۵۱
اے اسیرانِ قفس ، ۵۵

لبِ ساحل ، ۵۶
یک الفِ بیش نہیں ، ۵۸
ایک عمر سے اس لئے ہیں بے چین ، ۶۰
ایک نظم ، ۶۱
برفباری کی ایک رات ، ۶۲
سحر سے پہلے ، ۶۴
اب سرِ سرو و سمن ہے کس کو ، ۶۶

سدا رنگ

سر گم (نغمے سے آگے) ، ۶۹
خیال ایمن کلیان ، ۷۱
خیال درباری ، ۷۳
ایمن کا ایک اور روپ ، ۷۷
خیال چھایا ، ۸۰
کیدارا کا ایک روپ ، ۸۴

بوئے رفتہ

غزلیں ، ۸۹ تا ۱۰۴

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

موہنجودارو ، ۱۰۷
ٹھٹھہ ، ۱۱۷ تا ۱۲۲

بشنو از نے

گذشتہ پندرہ برس سے ہمارے ادب میں فن اور فنکار کے متعلق خاصی بحث آرائی ہو چکی ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ فن ' برائے زندگی ' ہونا چاہئے۔ ان حضرات کے نزدیک ادب کو زندگی کا بے داغ آئینہ بننا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر آن آگے بڑھتی ہوئی سیماب وش زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ ادب عوامی قدروں کا نقیب اور علم بردار ہو۔ اس لئے ادیب کو سب سے پہلے حال پر نظر دوڑا کر' حال کے لئے لکھنا چاہئے۔ حال سے آنکھیں موند لینا اور بزعم خویش ' دوامی قدروں سے ناطہ جوڑ لینا ' عوامی امنگوں کے ساتھ سخت بددیانتی ہے۔ اس لئے ادب اور فن کو ہنگامی بھی ہونا چاہئے۔

اس نظریے کی تفصیل ضروری نہیں۔ جس چیز کی ضد میں ادب و فن کا یہ نظریہ اتنا بلند بال اور جسور بنتا ہے وہ ' ادب برائے ادب ' (یعنی فن برائے فن) کا نظریہ ہے۔ اس نظریے کا ماحصل یہ ہے کہ فن و ادب اپنی انتہا آپ ہیں۔ زمان و مکان انہیں اپنا زندانی نہیں بنا سکتے۔ ان کے لئے زمانے کی قید اتنی ہی مہلک ہے' جتنی ملکی قومی یا جغرافیائی حد بندیاں — گویا فن کا آخری مقصد ' حسن مطلق کی تخلیق ہے '۔ انسانی جبلت کے خواص ' انسان کی ازلی ابدی امنگیں، اس کا حزن و ملال اور اس کی جذباتی کشمکش کے المیے ہی ادب و فن کے لئے موضوع '' لہ ' ہو سکتے ہیں۔

پہلے نظریے کی رو سے ادب اور فن کا یہ دوسرا نظریہ (مختصراً) شدید فرار پرستی اور مہلک رجعت پسندی ہے۔ اس لئے حال کی زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر نہایت فرسودہ اور بے معنی ہے۔

یوروپی ادب میں نظریوں کی یہ بحث اب بے حد فرسودہ ہو چکی ہے۔ یہ دونوں نظریے ہمارے ہاں یوں سرگرم ہیں کہ

ادب برائے زندگی عملی طور پر ، اور ادب برائے ادب اپنے خیالی وجود کے اعتبار سے حلقہ ھائے اثر رکھتے ھیں - مگر یورپ میں قریب قریب یہ دونوں نظریے ، اور ان کی متعصبانہ ھنگامہ آرائی اب تبر ک ھو چکی ھے - ان کے علاوہ انگلستان اور فرانس میں ادب و فن کے کئی اور نظریے رائج ھوھو کر ختم ھو چکے ھیں - لیکن ھمارے ھاں ان کی عملی تگ ودو ابھی باقی ھے -

میرے لئے ان نظریوں کی کشمکش بڑی الجھن کا باعث رھی ھے - اس کی وجہ یہ ھے کہ میں ان دونوں نظریوں کو کسی عنوان متضاد نہیں سمجھ سکا (مادہ پرست دنیا کی مصلحتوں کا ذکر نہیں کیونکہ اس میں تو کبھی سیاست ، کبھی موقعہ پرستی ، کبھی ذاتی اغراض ، ھر نظریے کو توڑ موڑ کر اپنا چاکر بنا لیتے ھیں) - خالص علمی اور نظری پہلو سے ان نظریات میں جس تفاوت کا ڈھول پیٹا گیا ھے ، اس کا وجود بھی حریفوں کی گرم گفتاری کی تخلیق ھے - میں سمجھتا ھوں کہ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ھی نہیں، گمراہ کن بھی ھے - کسی فن پارے کو ایک خاص زمانے کا ترجمان (Period Piece) ھی نہیں ھونا چاھئے - اگر کوئی فن پارہ ایک ماحول اور خاص زمانے کے لئے ھو ، اس میں چند مخصوص دنوں کے مخصوص ماحول کا عکس یا اس کی ترجمانی ھی نظر آئے ، یا اس میں کسی خاص زمانے اور خاص جماعت کے لئے کوئی فکری ، سماجی یا سیاسی پیغام ھو تو اس کی حیثیت میرے نزدیک محض ایک تاریخی دستاویز کی ھے - اگر اسے ادب پارے کا مقام حاصل کرنا ھے تو انہی وقتی اور ھنگامی باتوں کو دوامی مسئلوں اور ان کی دوامی علامتوں کا سہارا لینا پڑے گا - اگر شاعر اپنے ماحول کی باتوں کو انہی دوامی علامتوں میں ڈھال کر پیش نہیں کر سکتا تو (ماحول کا ترجمان ھو تو ھو) شاعر نہیں - ان معنوں میں شاعر نہیں ، جن معنوں میں شکسپیئر اور غالب ، گوئٹے اور اقبال شاعر تھے -

گویا زندگی ، جو ثقافت اور تمدن کی خالق ھے ، اپنی معرفت ، اپنی پہچان کے لئے فن اور ادب کے پر اسرار وسیلے ڈھونڈتی ھے - عربی کے اس مشہور قول (بقول بعض حدیث) کی طرح کہ " میں

(ذات باری) ایک مخفی خزانہ تھا ' میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اسی لئے میں نے خلق کو پیدا کیا۔'' زندگی بھی ایک خزانہ ہے جو پیدا بھی ہے اور پنہاں بھی۔ اس نے اپنی معرفت اور پہچان کے لئے فن و ادب کے نہایت لطیف اور پر اسرار وسیلے ڈھونڈے ہیں۔ اگر ان وسیلوں کو اصلی سوتے (زندگی) سے دور رکھا جائے تو ان کا سرمدی پانی خشک ہو جاتا ہے۔ اگر ان سوتوں کی آئینہ بندیوں میں زندگی اپنا جلوہ پیہم اور متواتر نہ دیکھتی رہے تو یہ سوتے خود زندگی کے لئے' اپنے منبع کے لئے نفی مطلق بن جاتے ہیں۔ اگر ان کے چلن اور ان کی تہذیب اور تسلسل میں زندگی ایک وجود محض کی حیثیت سے حصہ نہ لے تو ادب و فن ' خیالی طوطے مینا کیا ، وہم و کابوس کی بگڑی پرچھائیاں بن جاتے ہیں۔

دوسری طرف اگر ادب و فن ' محض وقت اور وقت کے تقاضوں کے ترجمان بنے رہیں ، معاشرے کی آئینہ برداری کا فرض بجالائیں اور بزعم خود اصلاح احوال اور پیام عمل کے نقیب بن جائیں تو وہ اپنا مقام اور معیار کھو دیں گے۔ انہیں اس مقام و معیار سے اتر کر کبھی پراپگنڈا ' کبھی وعظ و تذکیر' کبھی اقتصادی اور معاشرتی دستاویز یا منشور بننا پڑے گا۔ یہ ادب نہیں ہوگا ' اس پر ادب کا اطلاق کیسے ہو ؟ کیونکہ زندگی اسے اپنی معرفت کے لئے تخلیق نہیں کر سکتی ، یہ وہ ادب نہیں جس نے زندگی ماضی و حال و استقبال تینوں زمانوں ' اور کئی (Dimensions) کے احاطے میں بیک وقت زندگی کو اس کا چہرہ دکھانا ہے۔ اس میں نہ روایت کا حسن ماضی' پس منظر بنے گا ' نہ حال کے تقاضے زندگی کا ساتھ دیں گے ' نہ استقبال کی چھوٹ نظر آئے گی۔

(۲)

شعر کے متعلق ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر کو اپنے دل کے کسی پراسرار کرب کو آسودہ کرنے کے لئے لکھنا پڑتا ہے۔ مشرقیوں کی زندگی میں غم جان اور غم جاناں نے ہمیشہ سے بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ملال کے دنوں یا خوشی کی گھڑیوں کی یادیں یہاں حال کا اثاثہ بن جاتی ہیں۔ اس کے

علاوہ اپنے گرد پھیلی ہوئی متنوع زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ ہے جس سے رفتہ رفتہ تاثرات بنتے ہیں اور یہ تاثرات بھی وقت گزرنے پر یادیں بن جایا کرتے ہیں ۔ آج کل زندگی کرنا بڑا مشکل کام بن چکا ہے ۔ اس کے لئے ہمیں انہی یادوں (تجربات اور تاثرات) کو شکست دینا یا انہیں پوری طرح کچلنا پڑتا ہے ۔ یہی عمل ایسے موہوم اور معلوم کرب کا پیش خیمہ بن جاتا ہے کہ اس کی آسودگی کے لئے زبان کھلتی ہے اور پھر کچھ دیر کے لئے اطمینان ہوتا ہے کہ دل کی ستمگاری سے ہمیں لفظوں نے آزاد کرا دیا ۔ یہ اظہار اگر بالکل ذاتی سا ہو تو شاید پڑھنے والا دلچسپی نہ لے ۔ وہ یہی سمجھے گا کہ کہنے والے نے کمزوری کے لمحوں میں اپنی کسی پنہاں خلش کو منظر عام پر لانے کی جرأت کرلی ۔ یہ ایک ' اعتراف ' ہے اور بس ۔ اور چونکہ ہماری مہذب دنیا میں ' اعترافات ' (سننے والوں کے لئے) بڑے پریشان کن سمجھے جاتے ہیں لہذا اس ' اعتراف ' یا ' اظہار ' سے قطع نظر مناسب ہوتا ہے ۔ لیکن دل کا کرب لفظوں میں لانے کے لئے بصیرت اور خلوص' دو اہم شرطیں ہوا کرتی ہیں ۔ ان کی بدولت ہی ہر ذاتی تاثر یا انفرادی مشاہدہ ' فرد اور تخصیص کی تنگنائے سے نکل کر آفاقیت کی بیکرانی میں سماتا ہے ۔ یہیں سے ' تقریر' (اظہار و ابلاغ) میں وہ لذت پیدا ہوتی ہے جسے ہر سننے والا اپنے دل کی بات سمجھتا ہے ۔ یہیں سے ہر غم' غم یاراں بنتا ہے ۔ ایک کا درد ' سب کا درد اور ایک کی کہانی سب کی کہانی بنتی ہے ۔ اسی مرحلے پر پہنچ کر میری بات محض (لفظوں میں کسی چیز کا اظہار) نہیں رہتی بلکہ اس میں دوسروں تک پہنچنے کی اور ان کے دل کی بات بننے کی صلاحیت آتی ہے ۔ یوں کہئے کہ فن و ادب یہاں پہنچ کر ہی اظہار اور ابلاغ ، دونوں کا امتزاج بنتے ہیں ۔

لیکن اس 'عمومیت' کے عمل میں بھی فنکار کا ذاتی خلوص اور اس کی انفرادی بصیرت کار فرما رہتی ہے ۔ خلوص اور بصیرت کی اسی چھاپ کو کبھی لطف کلام کہا جاتا تھا ' اب اسے اسلوب اور انداز بیان سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ۔

اور اسی لطف کلام ، اسی اسلوب اور انداز کی بدولت یہ ممکن ہونا چاہئے کہ ہم کتاب چھوئیں تو لکھنے والے کو بھی چھو سکیں ۔

اس ساری بحث کا مدعا صرف یہ ہے کہ فن و ادب کے بارے میں آج کل ہر فنکار سے ایک نظریے ، ایک مقصد یا ایک لائحہ عمل کی ضرور توقع کی جاتی ہے ۔ یہ زمانہ وضاحت اور تشریح کا ہے ، رمز و ایما کا نہیں ۔ کنایات اب ذرا اس لئے بھی خطرناک ہوگئے ہیں کہ (وضاحتوں کے رسیا زمانے میں) ان کی گوناگوں تعبیریں اور تاویلیں کی جاتی ہیں ۔ اب ہر چیز ' سخن ' ہے ۔ جو بات ' ماورائے سخن ' کبھی سمجھی اور مانی جاتی تھی اب مشتبہ قرار پاتی ہے ۔ اسی کے پیش نظر میں نے چاہا ہے کہ جن باتوں نے یہ نظمیں اور غزلیں مجھ سے لکھوائیں ، انہیں ایک مبحث کی صورت میں لکھ دوں ۔ یہ نظمیں اور غزلیں میری زندگی کے ایک بڑے زمانے یعنی (۱۹۳۸ سے ۱۹۵۵ء) سے متعلق ہیں ۔ موجودہ عہد کی تاریخ میں یہ زمانہ ، عالمگیر جنگوں اور انقلابات کا زمانہ ہونے کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے ۔ نظری اور علمی تاریخ میں یہ زمانہ اپنی بوقلمونی ، اپنے تجربات ، اپنے اکتشافات و انکشافات کی بدولت شاید اب تک بے نظیر ہے ۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سارے دور میں ، معاشرے میں میری حیثیت ایک بہت ہی عام اور غیر اہم فرد کی رہی ہے ۔ اس دور کے نظری اور عملی انقلابات اور ہنگاموں میں مجھے ' تماشائی ' ہونے کا منصب بھی نہیں ملا ۔ کیونکہ اب عہد آفرین علمی یا عملی تبدیلیوں کا تماشائی بننا بھی اونچا کام ہے ۔ اس لئے یہ منظومات اس دور کی اسی حد تک عکاس ہیں کہ میں اتفاقاً اس دور میں زندہ رہا اور اپنے تاثرات ، مطالعہ اور تجربات (یعنی اپنے دل کی ستمگاری) کو لفظوں میں آسودہ کرتا رہا ۔ غالباً اسی لئے ان منظومات کا انداز مخصوص ہے ، ان کے الفاظ میرے انفرادی انتخاب نے ایک خاص انداز میں ڈھالے ہیں ، اور ان کی ہیئت میری ذاتی پسند پر مبنی ہے ۔

(۳)

اس مجموعے کا ایک حصہ (سدا رنگ) ہماری کلاسیکی موسیقی کے چند راگوں سے متعلق ہے ۔ ان نظموں کے بارے میں مجھے خاص طور پر چند گزارشات کرنی ہیں ۔

۱ ۔ ان نظموں کی تخلیق ایک مخصوص پس منظر سے متعلق ہے ۔ بنیادی طور پر یہ پس منظر اس خاص شغف سے عبارت ہے جو مجھے اپنی زندگی کے ایک دور میں کلاسیکی موسیقی سے رہا ہے ۔ اس شغف کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ میں دلی تحریک سے مجبور ہو کر خود ٹھاٹھ ' راگ ' تال اور لے کا علم عملی طور پر حاصل کرتا اور گاتا ۔ اس میں کئی باتیں حائل تھیں ۔ ایک تو وہ تربیت ہی تھی جس کی رو سے گانا بجانا ڈوم ڈھاڑیوں کا پیشہ سمجھا جاتا ہے اور اس سے حظ اٹھانا شرفا کا دستور قرار دیا گیا ہے ۔ دوسری اور اہم تر بات غالباً یہ تھی کہ کلاسیکی موسیقی سے حظ اٹھانے کے لئے جب ابتدائی معلومات حاصل ہوئیں تو پتہ چلا کہ کلاسیکی موسیقی کو عملی طور پر حاصل کرنے سے مجھے فائدہ نہیں ہوگا ۔ اور فن کو برائے فن حاصل کرنے کا نہ وقت تھا ' نہ اتنا دماغ تھا ۔ چنانچہ اپنے مرحوم دوست مشتاق احمد شیخ اور دوسرے ان گنت کرم فرماؤں کی بدولت میں نے کلاسیکی موسیقی کی تھیوری کو تھوڑا بہت سمجھ لیا ۔ اور پھر فنی اور جمالیاتی حظ کی وہ منزلیں آئیں جن میں ہر منزل کی نیرنگیاں اور رعنائیاں ہر آن بدلتی رہتی تھیں ۔ اور یہ سدا بہار رعنائیاں جب تاثرات اور محسوسات کی بوقلمونی میں آمیز ہوتی تھیں تو اپنے لئے اظہار کا راستہ ڈھونڈتی تھیں ۔ گویا صوت کے زیر و بم (موسیقی) کا یہ تقاضا میرے لئے ہر وقت موجود تھا کہ میں اسے لفظوں کی نقش گری (شعر) میں کسی طرح اجاگر کروں ۔

صوت کے زیر و بم کو لفظوں میں اجاگر کرنے کے سلسلے میں چند بنیادی باتوں کا خیال رکھا گیا ہے ۔ وہ یہ ہیں :

اولاً کلاسیکی موسیقی دن رات کی مختلف گھڑیوں میں مختلف بندشوں اور مختلف تاثر (یعنی راگ) کی قائل ہے ۔ اس نظریے کے مطابق ہر راگ راگنی اپنے مناسب وقت پر ہی وہ تاثر پیدا

کرسکتی ہے جس کے لئے اسے ترتیب دیا گیا ہے ۔ یہ تاثر ' رس ' کہلاتا ہے ۔ اسے اس مخصوص راگ کا بنیادی جذبہ یا خیال سمجھئے ۔ یہ صبح کی سہانی گھڑیوں میں عبودیت کا تاثر ہو یا چڑھتے سورج کے ساتھ دن کے ہنگاموں کا پیش آہنگ ہو ، آمد شام پر ایک ناقابل بیان اداسی ہو یا رات کی سونی گھڑیوں میں غم ہجراں — ہر تاثر سروں کی ایک مخصوص ترکیب و ترتیب اور ان کی بروقت ادائیگی میں مضمر سمجھا جاتا ہے ۔

اسی بات کو میں نے اپنی نظم 'سرگم' یا 'نغمے سے آگے' میں بیان کیا ہے ۔ راگوں پر باقی نظموں میں ' ان راگوں کے بنیادی جذبے یا تاثر (رس) کو ہی نظموں کا اصل موضوع رکھا ہے ۔ مثلاً ' ایمن ' کا بنیادی تاثر ایک غیر مختتم فراق کا ہے ۔ 'درباری' میں کسی صاحب اقتدار کا شکوہ اور اپنی بندگی و وفاداری' — اور ان دونوں باتوں کی گہرائی اور گیرائی کا رس ہے ۔ ' چھایا ' ہجر و وصال کے عجیب و غریب آمیزوں سے مزین ہوتا ہے ۔

۲ ۔ کسی راگ کو پیش کرنے میں عام طور پر چند لفظوں کا سہارا لیا جاتا ہے ۔ یہ بول (استھائی) عام طور پر اس راگ کے بنیادی تاثر کے مظہر ہوتے ہیں ۔ پرانے موسیقاروں کے لکھے ہوئے بولوں میں راگ کے ' ماحول ' اور اس کی لطافت کا پورا عکس نظر آتا ہے ۔ بعض بڑے موسیقار (مثلاً نعمت خان سدا رنگ ، شہنشاہ محمد شاہ رنگیلے پیا ، جان عالم واجد علی شاہ اختر ، عنائت حسین خان ، فتح علی خان وغیرہ) حقیقی معنوں میں شاعر بھی تھے ۔ ان کے تصنیف کردہ بولوں میں ایک راگ کا بنیادی تاثر (رس) اس جذباتی خلوص اور فنی حسن کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی رنج و راحت کی ایک پوری کہانی چند لفظوں سے ظاہر ہو جاتی ہے ۔ یہ کہانی بندگی اور عقیدت کی ہو یا کسی کے سفاک حسن کی داستان ، اپنی مہجوری کا بیان ہو یا گزری راحتوں کا تاسف — اس کا تاثر راگ کے بنیادی تاثر (رس) میں پورے فنی خلوص سے اجاگر ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی کی

پیشکش میں یعنی خیال، ٹھمری وغیرہ گانے کے لئے یہ بول ناگزیر سے ہو گئے ہیں ۔ ان بولوں سے راگ کی فضا کا نقشہ کھنچ جاتا ہے ۔ ان کی خالص شعریت راگ کی فنی لطافتوں کا اظہار بن جاتی ہے اور ان کی ڈرامائی کیفیت اس راگ کے حزن یا اس کی نشاط اندوزی کی ضامن بن گئی ہے ۔

مختلف راگوں نے میرے دل و دماغ پر جو اثر کیا ہے اس میں ان بولوں کا بڑا ہاتھ ہے ۔ ایک ایک راگ کے بیسیوں بول رائج ہیں اور ہر ایک کی بندش جدا گانہ حسن رکھتی ہے ، اور ان کا پھیلاؤ اسی مخصوص بندش کے تحت جداگانہ لطافت کا حامل ہے ۔ میں نے اپنی نظموں کے لئے ان بولوں کا سہارا لیا جو راگ، کے بنیادی تاثر (رس) اور اس کی ہیئت، دونوں کے بدرجہ اولیٰ ترجمان ہوں تاکہ ان بولوں سے اس راگ کی ساری فضا، اس کا بنیادی تاثر (رس) اور اس کا فنی حسن نظموں میں ڈھالا جا سکے ۔

اس اعتبار سے راگوں پر میری چند نظمیں، راگ اور بول (صوت محض اور الفاظ) کی منظوم تشریح ہیں، ایک ایسی وضاحت ہیں جو آواز اور صوتی فضا کو لفظوں میں بیان کرنا چاہتی ہے ۔

مختصراً ان نظموں کی اصل یہ قرار پائی کہ پہلے میرے شعور نے کسی راگ کے فنی تقاضوں کو سمجھا، بولوں نے اس کی فضا اور اس کے بنیادی تاثر کو مجھ پر واضح کیا — اس سے جو کیفیت میرے دل و دماغ پر چھائی، اس کی کہانی میں نے بیان کی — یہ وہی فضا، وہی تاثر اور وہی کہانی ہے جو اس راگ کی کہانی تھی ۔

۳ ۔ اب ان نظموں کی ظاہری ہئیت کے بارے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں :

کلاسیکی موسیقی کی سب سے اہم مروج صنف 'خیال' ہے ۔ اس کی پیش کش کا عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے پیرایۂ آغاز (الاپ) سامنے آتا ہے جو اس راگ کی مخصوص سروں اور ان سروں کی باہمی ترکیب و ترتیب کو واضح کرتا ہے ۔

پھر مقدمہ (استھائی) ہے جو انہی سروں کی ایک خوش آئند بندش اور اس بندش کا خوبصورت لفظوں (بول) میں اظہار کا نام ہے۔ یہ اس خاص راگ کی داستان کا ڈرامائی آغاز ہے۔ اور اس آغاز میں اُس راگ کا سارا ماحول، اُس کا بنیادی تاثر (رس) اور اس کی نغماتی فضا ایک خاص سانچے میں ڈھلی ڈھلائی سامنے آتی ہے ـــ کچھ دیر تک یہ بول، مخصوص سروں کے مختلف تغیرات کے ساتھ جھلائے جاتے ہیں یہ ' استھائی ' کا پھیلاؤ ہے ـــ اگلا مرحلہ عروج (انترہ) کا ہے۔ یہاں راگ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے۔ بولوں کی کہانی کا نقطۂ اوج بھی عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعدؔ اس راگ کی ساری پہنائی کی سیر شروع ہوتی ہے۔ یعنی اُس راگ کی مخصوص سروں کی ساری امکانی بندشیں پیش کی جاتی ہیں۔ جو جو الٹ پھیر، در و بست ' اور لف و نشر ممکن ہے وہ اس راگ کی ترکیبی سروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے تاکہ اس کی ساری وسعتیں سامنے آجائیں ـــ نصابی اعتبار سے یہی واپسی (ابھوگ) کا مرحلہ ہے کہ جس نقطے (استھائی) سے نغمے کا سفر شروع ہؤا تھا اس کے گرد ہر نوع کی آئینہ بندی ہوچکی ' اور اسی نقطے کو واپس ہوجائیں۔

راگ پر اپنی نظموں میں، میں نے یہی ترتیب مضمون رکھی ہے۔ راگ جیسے شروع ہؤا، جس طرح سروں کی بڑھت کے ساتھ بولوں کی کہانی آگے بڑھی ' عروج کو پہنچی اور پھر تکمیل تک آئی، اسی طرح یہ نظمیں بھی وہی تکنیکی التزام رکھتی ہیں۔ ہماری موسیقی کا قاعدہ ہے کہ راگ کی چال طبلے کی لے کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ گویا کہانی بڑے دھیرے پن (بلمپت لے) سے شروع ہوتی ہے۔ عروج تک پہنچتے پہنچتے اس میں گرم رفتاری در آتی ہے۔ رفتہ رفتہ دل کی دھڑکنیں اور نبضوں کی چال، بیان کا لہجہ تیز تر کردیتی ہیں ـــ راگ کی چال کو اصل سے دگنا تگنا یا چوگنا کرنے کا یہی مرحلہ ہے۔ یہی تیز روی (درت) ہے جو تکمیل کا آخری

باب ہے یعنی :

دھڑکنیں اب تیز تر ہیں ، لے بڑھے سنگت کرے
وجد میں ہے راگنی سے جھومتی نبضوں کی چال !

مندرجہ بالا التزامات کی روشنی میں ، راگ سے متعلق میری نظموں کو تشریحاتی اور تاثراتی منظومات قرار دیا جاسکتا ہے ۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ان نظموں کی بنیاد ، نغمے سے وہ گہری لگن ہے جسے میری عمر کے بہترین حصے میں ایک جامع کمالات شخصیت مرحوم مشتاق احمد شیخ نے میرے دل میں پیدا کیا ۔ ان نظموں کا دوسرا اہم بنیادی عنصر وہ کیفیت ہے جو ہماری موسیقی کی طلسماتی نیرنگیاں ہی پیدا کرسکتی ہیں ۔ اس نوع سے یہ نظمیں خود ایسے 'نغمات' ہیں جو سروں کی کسی ایک مخصوص بندش کو لفظوں میں لائے ہیں ۔ سر ' آواز محض ہے اور لفظ ، زیادہ سے زیادہ کسی چیز کی لغوی علامت ہیں ـــ اس طرح آواز محض کے ایک مجموعے (راگ) ، اس کے تلازمات ' اس کے ماحول ، اور اس کے تاثر کو لفظی کہانی میں ڈھالنے پر جو چیز بنے گی ' وہ بذات خود ایک نغمہ یعنی پروگرام میوزک ' ہوگا ـــ یہ نظمیں بھی چند راگوں کا پروگرام میوزک ہیں ۔ اگر ان راگ راگنیوں اور ان کے بولوں کا کیف ، حسب حال ذہنی تحریک پیدا نہ کرتا تو یہ لفظی نغمات وجود میں نہ آتے ۔

اسی لئے میں نے ان نظموں کے عنوانات بھی وہی رکھے ہیں جو ہماری موسیقی میں ان خاص راگ راگنیوں کے نام ہیں ۔ کوئی اور عنوانات ' نظم کے بنیادی خیال یا متعلقہ راگ کے تاثر کا سراغ تو شاید دے سکتے مگر یہ ظاہر نہ ہوتا کہ یہ نظمیں ایسے ' راگ ' ہیں جن میں فن موسیقی کو فن شعر کی قیود میں لاکر ' لفظوں میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

مختار صدیقی

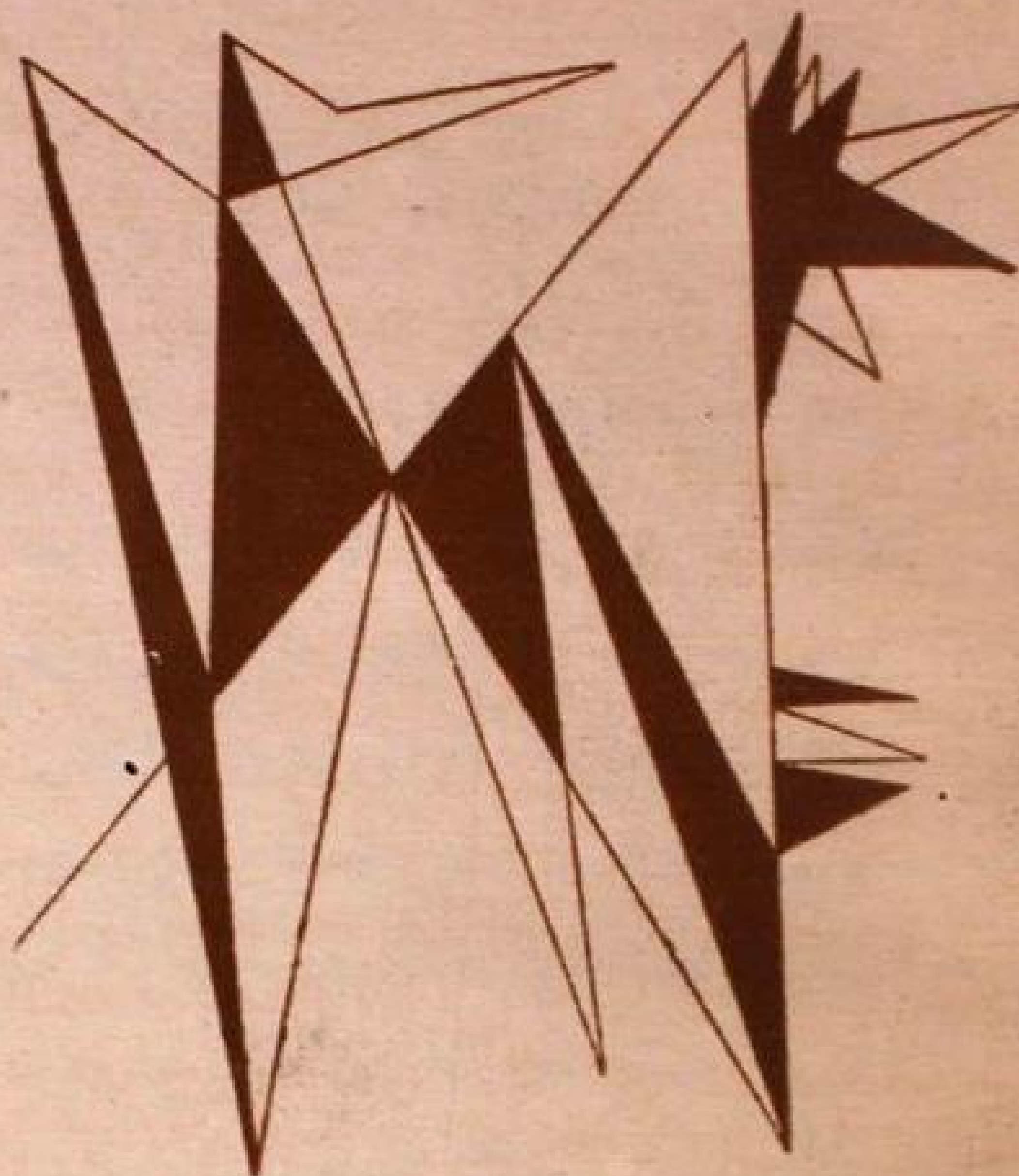

شب تاب

رات کی بات

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے

فرطِ بیتابی سے اٹھ اٹھ کے نظر بیٹھ گئی
تھام کر آس ہر آہٹ پہ جگر بیٹھ گئی
میرا غم خانہ عبارت رہا تاریکی سے
موجِ مہتاب کہاں خاک بسر بیٹھ گئی
شبنم آلود ہوا جاتا ہے شب کا داماں
تارے چمکے ہیں کہ اب گردِ سفر بیٹھ گئی
بھیگتی رات، نہا کر مرے اشکِ خُوں میں
جانے کو اٹھی ہی تھی، اٹھ کے مگر، بیٹھ گئی

اس نے دیکھا کہ مری رانی لجاتی آئی
آنکھیں ملتی ہوئی فتنوں کو جگاتی آئی

سر سے ڈھلکا ہوا آنچل، شکن آلود لباس
چڑھی آنکھوں میں مچلتی ہوئی نیندوں کی جھلک
سو گئی تھی ذرا خود، سب کو سلاتے شاید
نیند کچی تھی کہ دی وعدے نے دل پر دستک
چونک کر اٹھی تو دیکھا کہ ستارے بن کر
اوجِ افلاک پہ ہے مانگ کی افشاں کی دمک

شیشۂ مہ سے چھلک کر مئے تُند و بے دُرد
اس کے ماتھے سے چرالیتی ہے سونے کی ڈلک
«زُلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ مٹیں دو بالک»
چوڑیاں ہاتھوں میں تھامیں، چلی ہولے ہولے
کردے غمّازی مبادا کہیں چھاگل کی چھنک
میرے غم خانے میں پہنچی، تو کچھ آیا جو خیال
چوڑیاں چھوڑ دیں، چھاگل بھی ہنسی چھا نا چھنک

شکر ہے آئی تو ہے نیند کی گو ماتی ہے
چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے

سُکھ میں دُکھ

سر پہ رات آئی تو اک چندر کرن لہرائی
چار چاند آپ لگاتا تھا اندھیرے کا لباس
رات کی رانی بھی افشاں میں بَسی بیٹھی تھی
سُرخ ڈوروں کو چھپاتی ہوئی کاجل کی لکیر
اَن گنت فتنوں کے پردوں میں کَسی بیٹھی تھی
روئے زیبا پہ تبسّم کی سحر اترائی
چاندنی بکسی ، تو سورج مُکھی بن کر بھائی

میں ھی تاریکی کا پردا تھا ، اسی سے شاید
میری سورج مُکھی بنتی گئی غم کی صورت
میری تاریکی میں وہ لائی جھڑی ساون کی
نیِر میں ڈوب کے رم جھم سی جو برسیں آنکھیں
سُرمئی بدلی کوئی جھوم پڑی ساون کی
پھیلا کاجل تو اڑی پھیکی مسی سے شاید
سسکیاں نکلیں ۔ کوئی بگڑا کسی سے شاید

دیکھا جب پردہ چراغِ تہِ داماں کا ہٹا
دمبدم ہوتی ہیں لبریز کنول سی آنکھیں
آنسو آتے ہیں، چھلکتے ہیں کٹورے دونوں
اور، بے نیلم سی برکھا سے ہیں تر رُخسارے
میں بھی اور رات بھی ہیں کورے کے کورے دونوں
آنسو کتنے تھے کہ آلام کا بادل نہ چھٹا
بہنا بے سُود ہے، کیا درد مٹا رنج گیا

دُکھ کے سپنوں کا ہی رُوپ جو سُکھ کی لذت
میرے پہلو میں کوئی چیخ اٹھا یا قسمت!

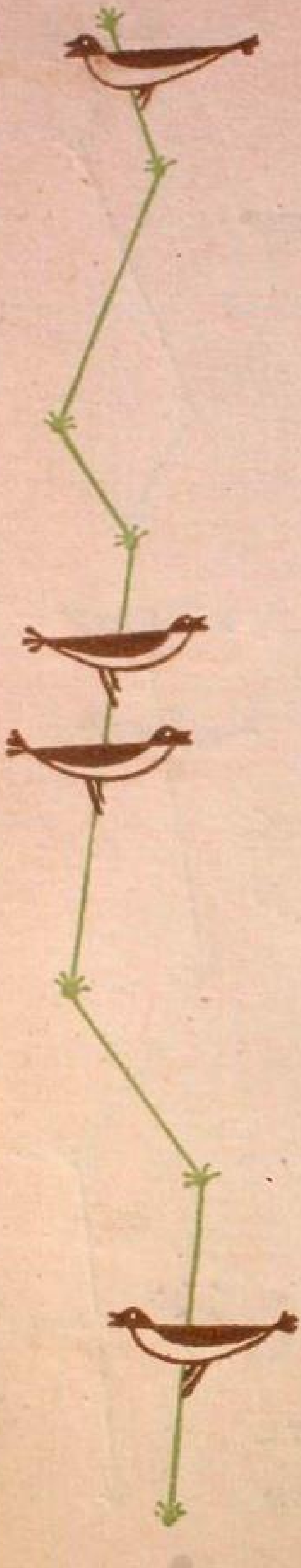

رُسوائی

(۱)

ٹِیکا لگاؤں ، مانگ بھی ، صندل سے بھر چُکوں
دُلہن بنوں تو چاہئے جوڑا سُہاگ کا
مہندی رچے گی پوروں کہیں جا کے دیر میں
کنگھی کروں تو چڑھتی ہے کالوں کی اور لہر
افشاں ہے بخت بھی کہ رہا ان کے پھیر میں
کہتی ہے سانجھ بھور کے اب گھاٹ اتر چُکوں
تم بیٹھو میں تو آئی پہ جی سے گزر چُکوں

•

اتنے دنوں تو دل کی لگی نے خدائی کی
پائل بجے ، تو بنسی کی دُھن ناچ ناچ اٹھے
بدنامیاں کرشمے مرے دیوتا کے ہیں
دیدے گُھما گُھما کے کہیں کیوں نہ گوپیاں
اِن کے چلن تو بگڑے ہوئے ابتدا کے ہیں
بپتا نہ ہوگی کل سے لگائی بجھائی کی
دھکے شفق ، تو دھکے چتا جگ ہنسائی کی

(۲)

چیخیں سن سن کے سبھی نیند کے ماتے جاگے

سامنے دھکی ہوئی آگ کا پیکر دیکھا
چل کے دو چار قدم، پھر سے پلٹ کر جولاں
چیخیں شعلوں کے دھکنے پہ لپک اٹھتی تھیں
دُود کے حلقے، رواں سوئے فلک، چرخِ زناں
سب یہ سمجھے کہ کوئی غولِ بیابانی ہے
یونہی لُوکا جو لگانے کو نکل آیا یہاں
باد پا آگ تھی، یا لال رسیلی، ساڑی
جھایا کالوں کی تھی شعلوں کی زبانوں کا دھواں

یک بیک کتنی باہیں بھی اٹھیں چیخ کے ساتھ
کانپتے آئے نظر، پھول سے مہندی بھرے ہاتھ

ایک نے بڑھ کے وہیں آگ پہ ڈالا پانی
آگ یوں پانی کی شہ پائے، تو دوزخ نہ بنے؟
جینے جی اشکوں سے کیا دل کی لگی بجھتی تھی
آگ پانی میں لڑائی جو چنا پر ہی ٹھنے؟
خاک ڈالی، تو ہوئیں پھر کہیں مدھم آنچیں
بخت رسوا ہو تو رسوائی بنا کیسے تنے

بوجھو جلنے کی تو جانے وہی جس تن لاگے
چیخیں سن سن کے ——————

ہرجائی

اتنی آنکھیں جن میں غلطاں مَد بھری گہرائیاں !
یہ — بھرے جوبن کی سرمستی سے چُور
کم سِنی ہے — نیم خام اِن کا سُرور !
اور یہ اٹھتی جوانی کی تڑپ سے ناصبُور !

اَن گنت ہوٹوں کی بے پایاں شفق دھکی ہوئی
دیکھئے کتنے سُبک ، کتنے سجل
کتنے چغتائی کی جان کاھی کا پھل
جن کا البیلا تناؤ پھول کی پتّی کا بَل
لعل گوں پاروں کی پھلواری سدا مہکی ہوئی

•

اور یہ کاکل ، یہ تاباں سانپ لہرائے ہوئے
کُندنی رُخ ، چاندنی راتوں کے راگ
شبنمی سونے میں یہ شعلوں کی لاگ
رنگ کا رس رُوپ کی صد رنگ آگ
جاگ اے ، آفاق کی چاھت کے میٹھے روگ ، جاگ !

دیکھ ! یہ جلوے پذیرائی کو ھیں آئے ہوئے !!

غزل

تیرے جلوے تیرے حجاب کو، مری حیرتوں سے نمو ملی
که تھا شب سے دن کبھی تیره تر، کبھی شب ھی آئینه رُو ملی

تیری قربتوں سے بھی کیا ھؤا، تری دُوریوں کا تو کیا گله؟
وه مقام مَیں ھی نه پاسکا، مجھے جس مقام په تُو ملی!

وه گھٹاؤں ھی سے برس پڑے، وه تری نگه سے چھلک اٹھے
کوئی بے خودی نه ھمیں ملی، که جو بے نیازِ سبو ملی

وه ھو فصلِ گل که ھوائے دَے، جو ملا کہیں تو جنوں ملا
مگر اک خرد ھی نه مل سکی، جو ملی، تو صرفِ رفُو ملی

آتش دان کا بُت

اَن کہی یہ ہے ، جو پتھر نے کہی مَیں نے سنی :

نوجوانی کی گراں خوابی میں
ابھی گھُلنے ہی کو تھی اس کی سجیلی کایا
جانا پہچانا وہیں لرزا کسی کا سایا
توڑے بیداری نے سپنوں کے روپہلی جالے
جھومی ، بکھری ہوئی ، زلفوں کی جبیں پر چھایا
چوڑیاں بول اٹھیں ، گیت کھنک میں ڈھالے
دھیان آنکھوں میں دھڑکتے ہوئے دل کو لایا
نیند کے جھونکوں کو پڑنے لگے جاں کے لالے
کسمساتے ہوئے بیتابی میں ـــ
کھولیں آنکھیں ، تو وہ سپنے کی تھی جھوٹی مایا

دل کو کھاتا ہؤا مبہم دھڑکا
کانپ کانپ اٹھتا تھا ننھا سا کلیجہ تھر تھر
شمعِ تنہائی سے ملتی نہ تھی گھبرائی نظر
یاد آجاتی تھی خاکسترِ پروانۂ دل

تہ بہ تہ سایوں میں لپٹی ہوئی سیمائے سحر
طعنہ دیتی تھی کہ روشن نہیں کاشانۂ دل
اور اشکوں میں خوشی کے نہ ستارے نہ قمر
ٹوٹتا جاتا ہے بے چھلکے ہی پیمانۂ دل
آج آہٹ پہ نہ پتّا کھڑکا —
نور کے گولے کو جا لے گا ابھی شب کا سفر

یہ خلش طعنے کی، «محرومیٔ سنگیں» میں ڈھلی
اَن کہی یہ تھی، جو پتّھر نے کہی، مَیں نے سُنی!

یونہی نیند اکھڑی، کسے آنا تھا؟ آتا جو کوئی
بُت تو خاموش ہے ـ اب سوئیں، بہت رات گئی

زوال

اولیں لغزشِ انساں ہی سراہی نہ گئی
ورنہ مفروضۂ اخلاق کی ڈھلتی چھایا
کل کے ناخُوب کو، خُوب آج بتاتی ہی رہی
یہ اوامر، یہ نواہی، تھیں پھسلتی بوندیں
وقت کے چِکنے گھڑے پہ کوئی باقی بھی رہی؟

اَن گنت صدیوں کی پامال روایت کی شہید
جانے وہ گُم شدہ جنّت کبھی تھی بھی - کہ نہیں
پھر بھی اس زیست سے اکتائے بھگوڑے ابتک
اسی لغزش سے ہیں نالاں، نہ وہ ہوتی نہ ہمیں!

مذہب و علم سے کیا شے تھی جو چاہی نہ گئی
اس بصیرت پہ بھی یہ کور نگاہی نہ گئی

مانتا ہوں، نہیں اس میں بنی آدم کا قصور
(کیوں نہ مانوں گا؟ بھلا میں بنی آدم سے نہیں)

ہاں مگر خُلد میں چندھیائی تھیں جس نے آنکھیں
جب سے اب تک اسی بجلی سے رہا ساتھ اپنا
علم و مذہب کی بصیرت سے تو انکار نہیں
ہاتھ میں تو اسی بجلی کے رہا ہاتھ اپنا

«نصف بہتر» بنی آدم کا نہ کیوں کر بنتی؟
جس میں ہو ایزدِ باری کا سا نیرنگِ شہود
کبھی ہمشیر ، کبھی ماں کی مقدّس ہستی
ساتھ ہی ساتھ کبھی شمعِ شبستانِ وجود!

چہرہ مہتاب ، کھُلے بال شبِ تیرہ و تار
لیجئے قدرت کے مظاہر بھی ، سمٹ آئے یہیں
اور وہ اولیں لغزشِ سے گنوائی جنّت
اس کے قدموں تلے آئی ، چہ زمان و چہ زمیں

پھر بھی اس «پَرتوِ یزداں» سے تباہی نہ گئی
اولیں لغزشِ انساں ہی سراہی نہ گئی

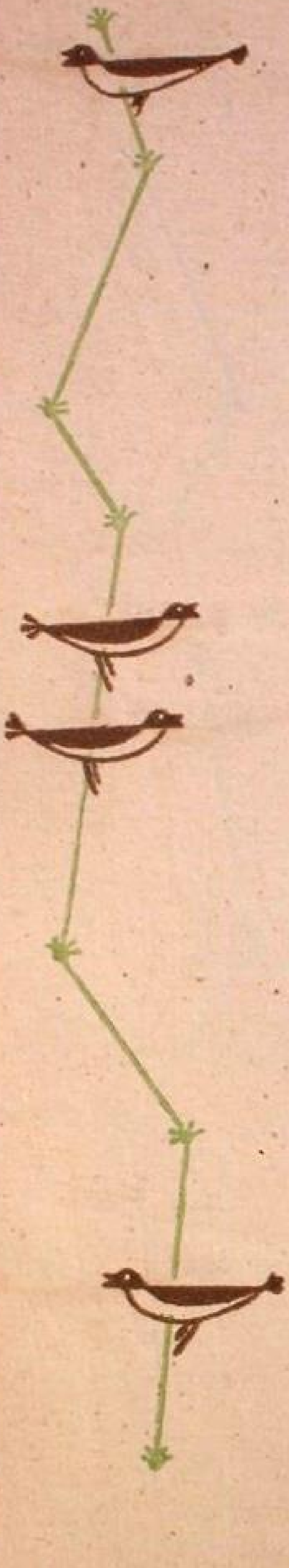

اناؤنسر

سُرخ بتّی نے اشارے سے کہا ہے — بولو !
کھوج نظروں کا مِٹا ، بات کے بندھن ٹوٹے
میرے الفاظ کو لہروں کا کوئی پیمانہ
چِھین لے جائے گا ، دُوری کے بہانے جھوٹے

منہ سے جو نکلے ، اسی بات سے ناطہ چھوٹے
دل میں باقی رہے موہوم سا احساسِ زیاں
میں یہ سوچوں کہ ہر اک دشت بھی ، آبادی بھی
میرے الفاظ کی تشہیر کا دیکھے گی سماں

اور بے نام و نشاں ، دیکھی نہ بھالی لہریں
ایک عالم میری باتوں کا ڈھنڈورا پیٹیں !

غزل

درد ، شرمندۂ درماں نہ سہی
جینا مشکل نہیں ، آساں نہ سہی

دیکھیں ، بیتاب رہیں گے کب تک ؟
چین دل کو کسی عنواں نہ سہی

وحشت آثار ، در و بام ہیں کیوں
یہ مرا گھر ہے ، بیاباں نہ سہی

سُننا پڑتی ہیں سبھی کی باتیں
بات کچھ بھی نہ سہی ، ہاں ، نہ سہی !

راز ہے طرزِ بیاں سے رُسوا
چاک دل چاک گریباں نہ سہی

مل ہی جاتا ہے سُراغِ جاناں
نکہتِ زلف ، پریشاں نہ سہی

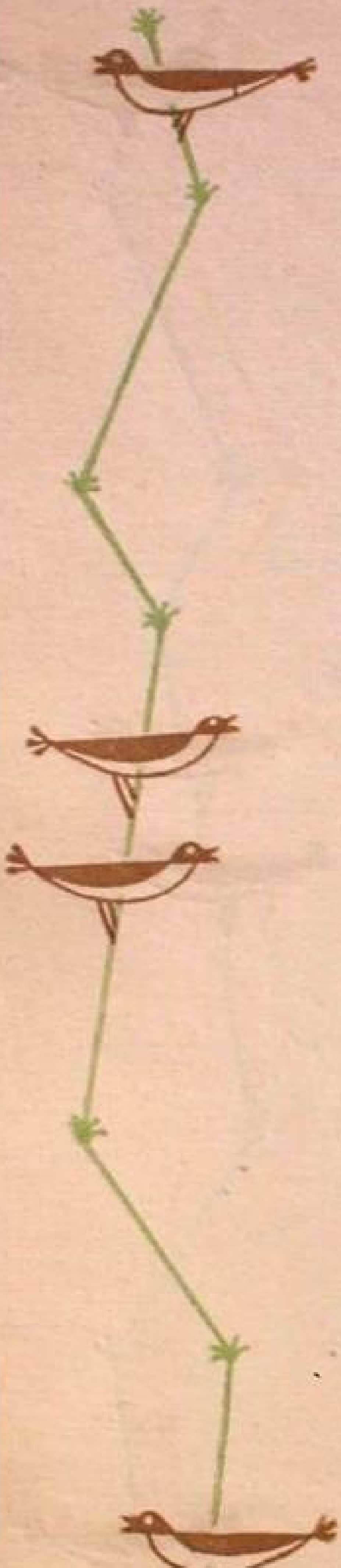

غزل

موت کو زیست ترستی ھے یہاں
موت ھی کون سی سستی ھے یہاں

دم کی مشکل نہیں آساں کرتے
کس قدر عقدہ پرستی ھے یہاں

سب خرابے ھیں تمنّاؤں کے
کون بستی ھے جو بستی ھے یہاں

چھوڑو بے صرفہ ھیں ساون بھادوں
دیکھو ھر آنکھ برستی ھے یہاں

اب تو ھر اوج کا تارا ڈوبا
اوج کا نام ھی پستی ھے یہاں

ایک تمثیل

« حجلۂ گور میں سامانِ عروسی ہوگا
لاش آرام سے سوئے گی سہاگن بن کر ! »

(۱)

رخصتی ہوتی ہے ، جاتی ہے دُلہن کی ڈولی
باری باری یہ اعزّہ ابھی کاندھا دیں گے
دھن پرایا تھا — مگر آج پرایا ہوگا
فرطِ رقّت سے ہوئی جاتی ہیں پُرنم آنکھیں
کون ایسا ہے جو اس وقت نہ رویا ہوگا
روتی آنکھوں میں چھلکتے ہیں لہو کے قطرے
پھول ہنستے ہیں ، مگر خون ٹپکتا ہوگا
گل بداماں ہے کہ اک خرمنِ گل ہے ڈولی
دوش پر پھول نہیں ، باغ مصلّیٰ ہوگا
کوئی دم ہے کہ اسی خرمنِ گل کے صدقے
حجلۂ خُلد نشاں اور مہکتا ہوگا
ہے جو خلوت میں ، یہ وارفتہ لپٹ یلے کی
دل میں نوشہ کے مگر حشرِ تمنّا ہوگا !
سمٹی سمٹائی ، لجاتی ہوئی ، آئی ہے دُلہن !
داخلِ گلشنِ جنت ہوئی ، جانِ گلشن !!

(۲)

لئے آتے ہیں سبھی داغِ جگر کے مالے
خیر سے آج، دلہن کے ہوئے چوتھی چالے
زیبِ تن ہوگا نیا آج عروسی جوڑا
گردِ مہتاب پڑیں گے نئے سیمیں ہالے
پھر نئے سر سے اعزّہ کی ضیافت ہوگی
پھر سے رقّت میں لہو روئیں گے رونے والے
ڈھیریوں پھول مہکتے ہیں پڑے خلوت میں
اور خوشبو سے ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
منہ چھپائے ہوئے گھونگھٹ میں ہے رادھا رانی
گرچہ خلوت میں نہیں سانوری صورت والے!

لاش آرام سے سوتی ہے سہاگن بن کر
گوہرِ اشک سے آنکھوں کی بھری ہے جھولی
رخصتی ہوتی ہے، جاتی ہے دُلہن کی ڈولی!!

قبر میں پہلی رات

یہ تکلّف بھی مرے اپنوں کا اک چرکا ہی تھا
ورنہ اس گھر کے لئے یہ غُسل یہ اجلا لباس؟
آبِ زمزم کے یہ چھینٹے یہ نئی سج دھج، یہ باس؟
سرد ویرانی، نمی کے بوجھ سے گھٹتی فضا
تہ بہ تہ، ٹھہری ہوئی تاریکیوں کے دَل پہ دَل
یہ گھروندا ہے مری منزل؟ مرا اصلی محل؟
آئیے، بچپن سے سُنتے آئے تھے آئیں گے آپ
آپ کی یہ پُوچھ گچھ، جائز تو کیا، برحق سہی
زردیاں مقسوم تھیں جس کی وہ چہرہ فق سہی
میرا کیا سب کا خدا وہ ذاتِ بے ہمتا تو ہے
سو اُلہنے دیجئے لیکن میں آیا ہوں ابھی
ایسی دنیا سے، جہاں زر کی خدائی ہی رہی
کعبۂ ایماں سبھی کے ہیں وہی ختمِ رُسل
ہاں مگر میں کیا، نجات و آخرت تھی کس کو یاد؟
آلِ پیغمبر کے خُوں پہ ہوتا ہی آیا ہے صاد
اچھا یہ کہئے کہ اب جی کس طرح بہلائیں ہم
داد خواہی کے لئے لائے ہیں پیراہن کے چاک
مائلِ رَم کیا کوئی اب بھی رہے گا زیرِ خاک؟

برزخ

فکرِ جنّت ھے ، نہ تادیب کے شعلوں کا ھراس
شکر ھے کوئی تو دنیا ھے ، جہاں آج نہ کل
نیم مدھوشی تھپکتی ھے میری آنکھوں کو !
ھلکے خوابوں سے ھوئی جاتی ھیں پلکیں بوجھل
ھر رگ و پے میں رچا جاتا ھے اک نرم گداز
دھڑکنیں گُنگ ھیں اس وقت ابد ھے نہ ازل
آج بھی اب بھی تھکی رُوح نہ کیوں سُکھ پائے
مَنتّیں موت کی مانیں ، تو یہ لمحے آئے

•

غمِ امروز بھی اندیشۂ فردا بھی مٹا
اور ماضی کی بہاروں کا خیال آیا ھے
سامنے آئے ھیں بچپن کے طلسمی سپنے
اپنے ڈوبے ھوئے تاروں کا خیال آیا ھے
یاد آئی ھیں جوانی کی نشیلی گھڑیاں
بے اماں میکدہ زاروں کا خیال آیا ھے

پہلی چاہت نے بنائے تھے جہاں رنگ محل
ان کٹھن راہ گزاروں کا خیال آیا ہے
جن کو ہم نے کبھی جینا ، کبھی مرنا سمجھا
آج ان جھوٹے سہاروں کا خیال آیا ہے

خیر اب پاپ کٹا ، دیکھئے کیا یاد آیا
درد ہستی کا مِٹا کیا ، کہ خدا یاد آیا

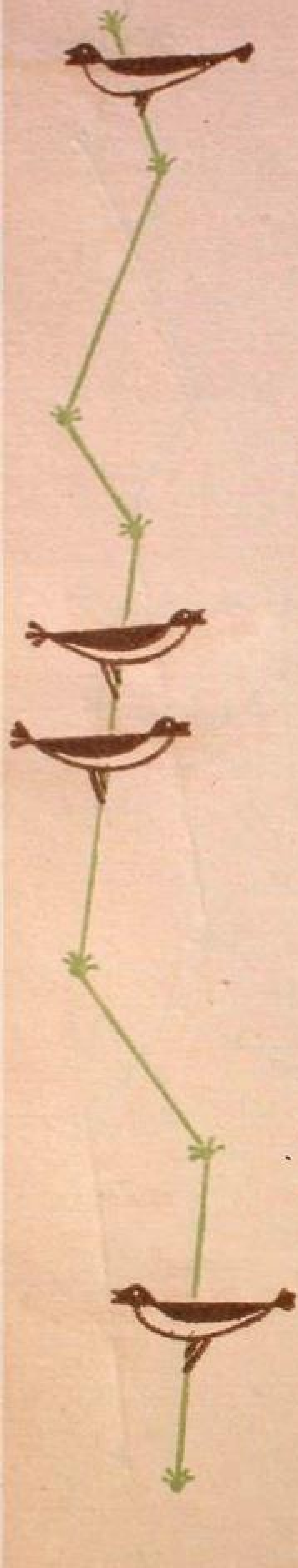

غزل

اب دُکھ سے ہؤا نباہ اپنا
جینا ہؤا آہ آہ اپنا

وہ دَور بھی آئے گا الٰہی ؟
جب حال نہ ہو تباہ اپنا

ہم ہی تو تھے عینِ ذات لیکن
ہونا ہؤا سنگِ راہ اپنا

پاداش ہے جس کی ، زندگانی
وہ کون سا تھا گناہ اپنا

اس کی بھی نہ مانئے شہادت
درد آپ کا ہے گواہ اپنا

شاید کہ سند ہوئی ہے بے داد
چُپ چُپ سا ہے داد خواہ اپنا

غزل

نورِ سحر کہاں ہے ، اگر شامِ غم گئی
کب التفات تھا ، کہ جو خوئے ستم گئی

کن منزلوں کی دُھن ہے ؟ کہ اب بیش و کم کی لاگ
مجبورِ زیست ، دل سے ترے یک قلم گئی

کیا لوگ تھے کہ جو غمِ جاناں میں مر مٹے
اے روزگار ، کیوں تری گردش نہ تھم گئی

کچھ تو خزاں کا پاس بھی لازم تھا نغمہ گر
مانا ، بہار ، خالقِ ہر زیرِ و بم گئی

اب ہو چلی ہے ، زندگی کرنے خُو ہمیں
اب مہرباں نہ ہو ، کہ امیدِ کرم گئی

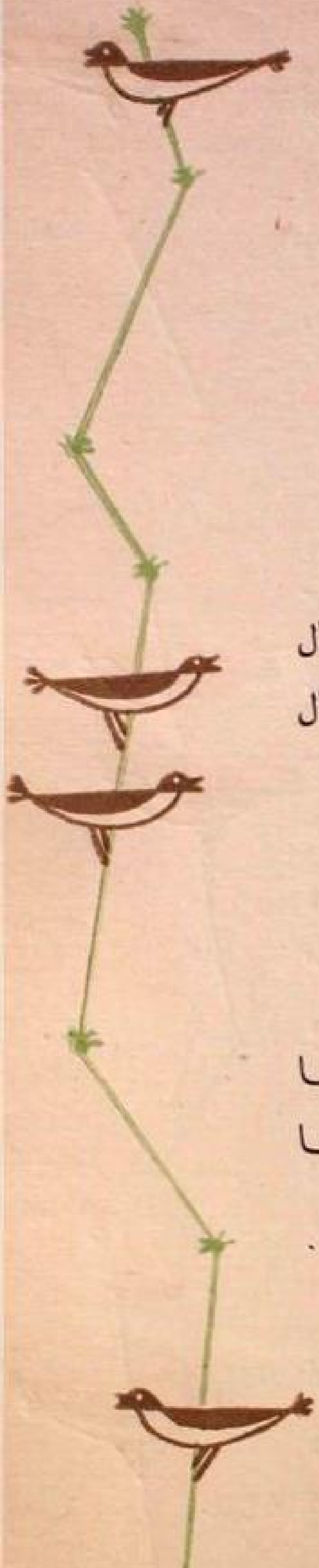

آخری بات

میں نے اِن آنکھوں سے دیکھی نہیں وہ بربادی
جس سے باقی نہ رہیں سمت وجہت کی قیدیں
مٹ گیا غرب ، وہ تہذیب کا منارۂ نُور !
شرقِ تیرہ بھی نہیں آج کے دن دنیا میں
کیا جنوب اور شمال ، ان کی نہ دیجئے گا مثال
آج تک ان کا چلن ہو نہ سکا شاملِ حال

شہ نشینوں میں تصوّر کے بھی اب کیا ہوں گے
ہر عقیدے کی سیاست کے وہ سیمیں معبُود
بھائی چارے کے، کپٹ راج کے ، فوقیّت کے
دیوتا کل کے ، مگر ڈھونڈئے آج ان کا وجود
آج بربادی ہی دنیا کی خدا ہے گویا
جس نے بربادی ہی کو خلق کیا ہے گویا

ہمہماتی ہوئی آبادیاں شمشان ہیں اب
اَن گنت شہر ہیں ملبے کے سلگتے تودے
جھلسی دیواریں در و بام پہ ہیں نوحہ کناں
کہتی ہیں — «اپنا مکیں کوئی کہیں ہو تو سنے
خشت و آہن کے اس انبار سے وحشت نہ کرو
آؤ یہ گھر تھا تمہارا جہاں تم پھولے پھلے

اور اس راکھ کو آنکھوں کا بنا لو سرمہ
یہ وہ دانش گہِ مشہور تھی تم جس میں پڑھے
وہ تھا سلطانیٔ جمہور کا ایوانِ عزیز
اس کتب خانۂ نادر کے کھنڈر سے آگے»
اور مکیں ہو تو کہے ـــ میرا وطن یہ تو نہیں
وہ تو تاریخ کا مامن تھا ، یہ مرگھٹ کی زمیں

یہ وہ ہیں جن کا کوئی نام و نشاں ہے تو سہی
کچھ تو یوں مٹ گئے جیسے کہ کبھی تھے ہی نہیں
ناگا ساکی ـــ جو سجل خواب تھی جل پریوں کا
سیم بر کُہر میں لپٹا ہؤا نیلم کا نگیں
سر پہ اوتاروں کے رَمنے وہ مقدس پربت
پاؤں چھوتی ہوئی ذخّار سمندر کی جبیں
صاف شفّاف سی آبادیاں ، نیلے ساحل
ہر سفینے کے لئے طرفہ طلسموں کی زمیں
اور ہیر و شیما، وہ صنعت کا نیا گہوارہ
یعنی مشرق کی ترقی کا امامِ پیشیں
زلزلے آئے نہ آشوبِ قیامت سے مٹے
دونوں اک ذرّے کے جوہر کی کرامت سے مٹے!

اس کرامت سے مگر مٹ کے بھی جو بچ نہ سکا
دیکھئے جا کے وہ پگھلا ہؤا اندھا پاتال
اُس عدم زار میں سرگرم ہیں برقی لہریں!
جن کی ترکیب سے ماضی کو ملی صورتِ حال

دیکھتی آنکھوں ذرا دیکھئے سائے ان کے
خاک کا جن کا کوئی کھوج لگانا ہے محال
کارکُن ، محنتی ، مزدور ، ہمکتے بچے
بن گئے دوزخی آسیب کی پرہول مثال
یہ ہے قابیل کی تاریخ کا وہ بابِ فنا
جس پہ عبرت کو بھی ہوتی نہیں رونے کی مجال
تابِ گِریہ ہو تو پھر بھی نہ بہیں گے آنسو
کون «فاشست» ہے ، دین کا دنیا کا عُدو

•

اور اب ٹینک اپاہج ہوئے توپیں ٹھنڈی
پر شکستہ ہے فلک سیر تباہی کا جنوں
خون سے سینچی ہوئی خاک نے نِگلیں فوجیں
جوہرِ ذرہ نے یوں پھونکا ہے اپنا افسوں
ضامنِ امن اسے مانئے جیسے تیسے
«خون ہی ہم میں نہیں خون بہے گا کیسے»

•

وقفہ

اب تو رگ رگ میں ہے ساری نیند کی موجِ سرور!
لمحہ بھر پہلے کے طوفانی خیال اب ہیں نڈھال
کھو چکے بپھرے ہوئے جذبات اپنے جی کا زور
نیم بیداری کے رس میں جھومتے سپنوں کے جال
گردشِ خوں میں بچھاتے ہیں، نئی لذّت کے چور
جسم و جاں ہیں اس انوکھی خوشی سے چُور چُور!

چومنے کو ہے ان آنکھوں کو تھکی پلکوں کا بار
ایک لمحہ پیشتر، جن کی حزیں پہنائی میں
رچ گئی تھیں وہ رسیلی، نیلی نیلی انکھڑیاں
سست گہرے سانس میں بستی ہے وہ بھینی سی باس
جو ابھی ان تیز سانسوں کی تپش میں تھی رواں
اب وہ اعضا غرق ہیں اک راحتِ ہرجائی میں
جن میں گھلتی تھیں ابھی اس جسم کی رعنائیاں
چھا رہا ہے ذہن پر تسکین کا البیلا غبار!

لمحہ بھر کے بعد ہم ہوں گے، نہ یہ کیفیتیں
ڈوب جائے گا سبھی کچھ راحتوں کی جھیل میں

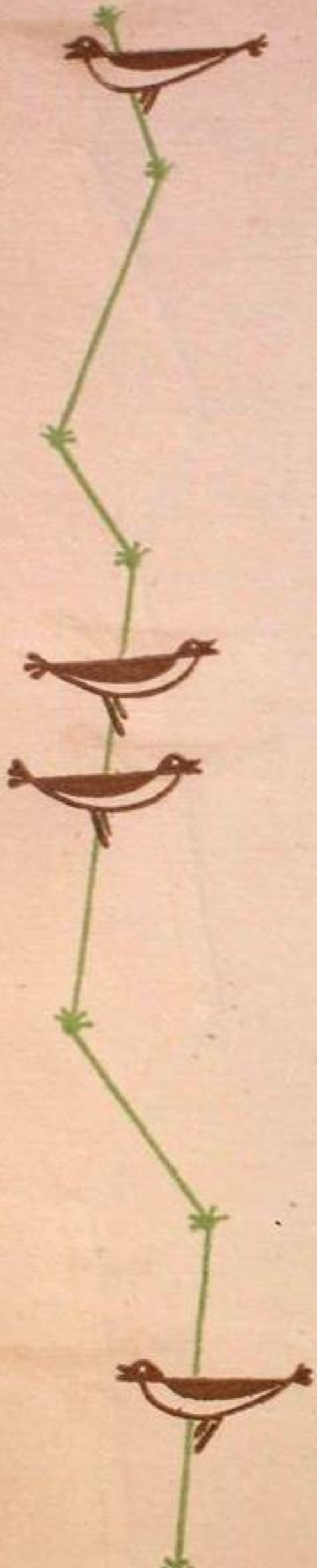

غزل

کیسی یادوں سے کہوں دل سے وہی گھاتیں کرو
چاہتوں کے رس میں ڈوبے ناز کی باتیں کرو

خوابِ بیداری سے جی بہلاؤ جب تک بن پڑے
جیسے دن کاٹے اسی انداز سے راتیں کرو

کچھ نہ کچھ تو ان کٹھن تنہائیوں کو دو فریب
ہاتھ پھیلاؤ ، دعا مانگو ، مناجاتیں کرو !

دل زدوں کو یوں بھی ہونا چاہئے رُت کا خیال
جو بھی کچھ کرنے کو کہتی ہیں یہ برساتیں ،کرو

غم کی اس بیزار یکسانی کا کچھ تو ہو علاج
ہم نہیں کہتے کہ ان سے ہی ملاقاتیں کرو

334

باز یافتہ

اچھا خاصا سبک سا نقشہ
چہرہ پیلا ، لباس سادہ
ماحول سے جیسے تھک چکی ہو
تنہا ، تنہا ، بِلا ارادہ !

آنکھیں جو کبھی رسیلی ہوں گی !
اب ان کی اداسیوں کی تہ میں
کیا کیا نہ تھے جان گُسِل فسانے
ہم آپ تو بے سُنے ہی سہمیں

طوفان میں جو ناؤ کھوگئی تھی
پھر آن لگی ہے اِس کنارے
یوں تو ہے خدا کا شکر واجب
لیکن کسے ناخدا پُکارے ؟

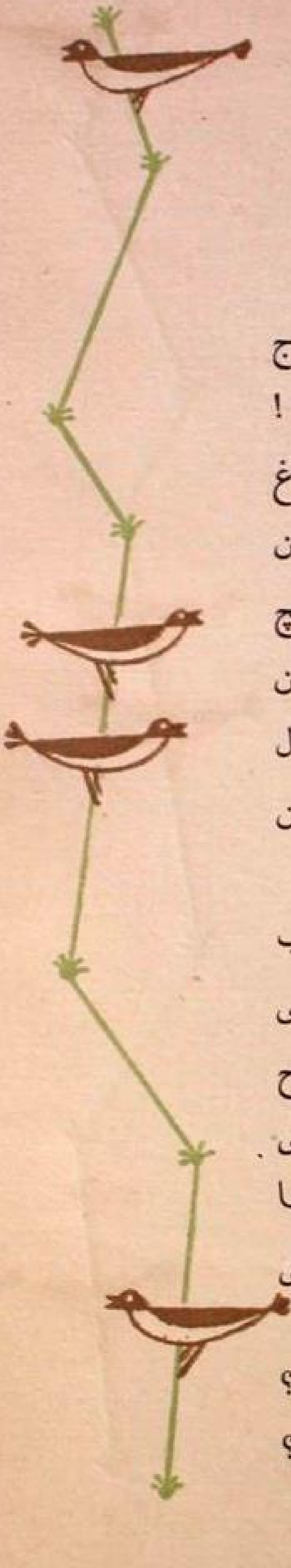

کیسے کیسے لوگ

شام ہی سے دل میں ایسی بے کلی جاگی تھی آج
چاندنی بھرتی رہی تھی ، جس میں یادوں کی جلن !
نرم جھونکے لائے تھے ، اُس بوئے رفتہ کا سراغ
جس سے در آئی تھی ، دل مٰیں پہلی چاہت کی دُکھن
سامنے آئے تھے اپنی زندگی کے اونچ نیچ
یعنی جی سکنے کے سارے کردہ نا کردہ جتن
ٹوٹتے تاروں سے اُن لوگوں کا آیا تھا خیال
مرگِ ارزاں جن کی گمنامی کا ھے اندھا گہن

موت اسی انبوہ کی شاید نہ تھی جشنِ طرب
جیسے ہم سب کے جئے جانے کے ضامن تھے وہی
اور اُنہیں حالات کی گردش نے پیسا اس طرح
کارکُن دنیا میں بے مصرف رہے جیسے وہی
دیدۂ قدرت میں یوں محبوب تھی اپنی بقا
جیسے انسانوں سے مخلوقِ فروتر تھے وہی

یہ بقائے بہتریں کی مصلحت تھی بھی ، تو کیا ؟
کیوں فنائے کمتریں کا اک بہانہ تھے وہ لوگ ؟

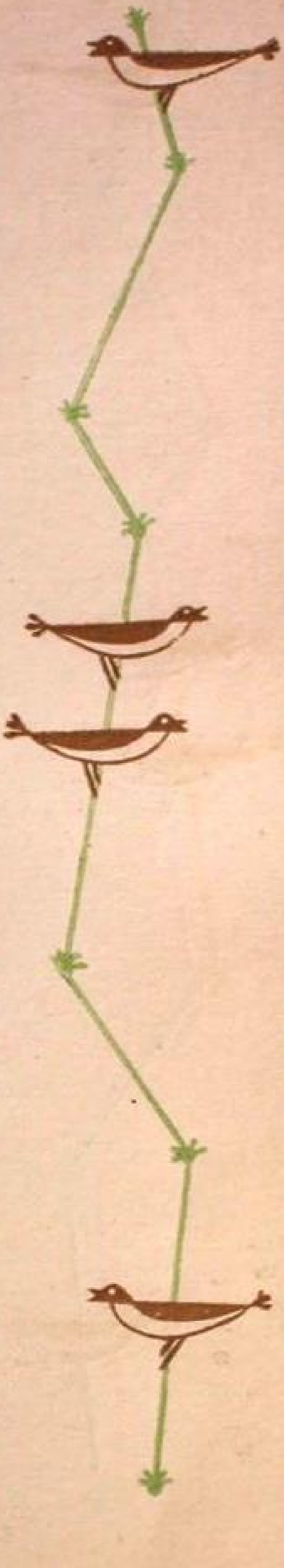

ان میں کیا باتیں نہ تھیں جن سے ہمیں ہیں بہرہ ور ؟
اب کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کیا کیا تھے وہ لوگ
اور ان لمحاتِ خونیں ہی سے پہلے اک عُمر
اس اٹل قانون کو کیوں کر گوارا تھے وہ لوگ ؟

شب کی تاریکی مٹادیتی ہے کیا کیا امتیاز
ہر خرابے کا ، ہر آبادی کا مامن — خامشی !
ان کے بے نام و نشاں مدفن پہ بھی ہوگی یہ رات
ان کی ویراں بستیوں پر چھٹکی ہوگی چاندنی

پُر سکوں نیندوں میں گم ہے جینے والوں کا جہاں
وہ — جنہیں اوروں کے مرنے سے ملی ہے زندگی
وہ — جنہیں بہتر سمجھ کر دی ہے قدرت نے بقا
ان میں کتنے ہیں جنہیں ہے زندگی کی آگہی ؟
ہر کوئی ماحول کی بے اعتنائی کا اسیر
ہر کسی کے دل میں سوتی ہوگی کیسی بے کلی !
کیسی خاموشی سے رات اپنے سفر پر ہے رواں
نرم جھونکوں میں رچی ہے ، اوس کی ہلکی نمی

پُرسکوں نیندوں میں گم ہے جینے والوں کا جہاں
وہ — جنہیں اوروں کے مرنے سے ملی ہے زندگی
وہ — جنہیں اوروں کے مرنے سے ملی ہے زندگی

قریۂ ویراں

جُھلسے پیڑ ، جلی آبادی ، کھیتی سوکھی ، خرمن راکھ
ہست وبُود کا مدفن — راکھ !
گرتے بام و در کے لئے ہے گلیوں کا آغوش
جیسے یہ دیواروں کو تھے کب سے وبالِ دوش
بار ہٹا تو آیا ہوش

پنگھٹ اور چوپال بھی سونے راہیں بھی سنسان
گلیاں اور کوچے ویران !
جھونکے سوکھے پتے رولیں ، بکھری راکھ اڑائیں
راکھ اور پتے بن کے بگولے ، اپنا ناچ دکھائیں
اور وھیں رہ جائیں !

یہ بستی اب توڑ چکی ہے ہستی کی زنجیرِ گراں
اور قیودِ زمان و مکاں
وقت کے ڈاکو چکر اس کو بساط مطابق لوٹ چکے
اس کے لئے ماحول و فضا کے سارے بندھن ٹوٹ چکے
ماضی و حال بھی چھوٹ چکے

کون آئے جو آکر اس میں زیست کے رنگ بھرے
کھیتوں کو سر سبز کرے !
گلی گلی اور کوچہ کوچہ پنگھٹ اور چوپال
کھیلتے بچوں ہنستی جوانی سے کردے چونچال !
زندہ کردے ماضی و حال !!

منزلِ شب

پھر بھڑک اٹھی ہے ان دلدوز فریادوں کی آگ
نیند کے چڑھتے نشے میں جو ڈبوئی تھیں ابھی
دل کو برمانے لگی ہیں بے صدا سر گوشیاں
نیم بیداری کے رس میں جو سموئی تھیں ابھی
اب کہاں ہے راحتِ قُربت کی مخموری کا رنگ
اور تم — میرے خم بازو میں سوئی تھیں ابھی

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں — نکہت تھے وہ لوگ
کس جہنم کی خدائی ، جن کی جنّت میں ہے اب
کتنے نستعلیق ، کتنے خوبصورت تھے وہ لوگ
کن درندوں کی غلامی جن کی قسمت میں ہے اب
ان کی ہستی ان تمناؤں کی حِدّت میں ہے اب :
کاش وہ دن آئیں جب ، انسان سمجھے جائیں ہم
یہ بہشتی سر زمیں جس دستِ قدرت میں ہے اب
کاش وہ دن آئیں جب اس کو فنا کر پائیں ہم
اپنی وادی اپنے کہساروں کو هم اپنائیں ہم !

گھرے سناٹے لرزتے ہیں کہیں جھونکا کوئی
دم بخود پتوں کو چونکاتا پھرا ہے ڈال ڈال
ہر رگ وپے میں ہے ساری ، ایسا انجانا گداز
ڈوبتے دل کو ہوئی تاروں کی چشمک بھی وبال

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں — پہچانو انہیں
یہ سبک سر ہیں انہی روحوں کے بھٹکے قافلے
جن کو تم ، منزل کے متوالوں نے چھوڑا راہ میں !
آگئی منزل — تو غیرت مندیوں کے حوصلے
تم میں اطمینان کی ہر سانس نے پیدا کئے ،
ورنہ جو بے بس ، تمہاری جان کا صدقہ بنیں
ان کی خاطر کیوں یہ تدبیروں کے لمبے سلسلے ؟
چاہتیں ان کی ، یہاں آکر ہی ، کیوں دعوی بنیں ؟
غیرتیں ، منزل نشیں ہو کر ہی کیوں سودا بنیں ؟

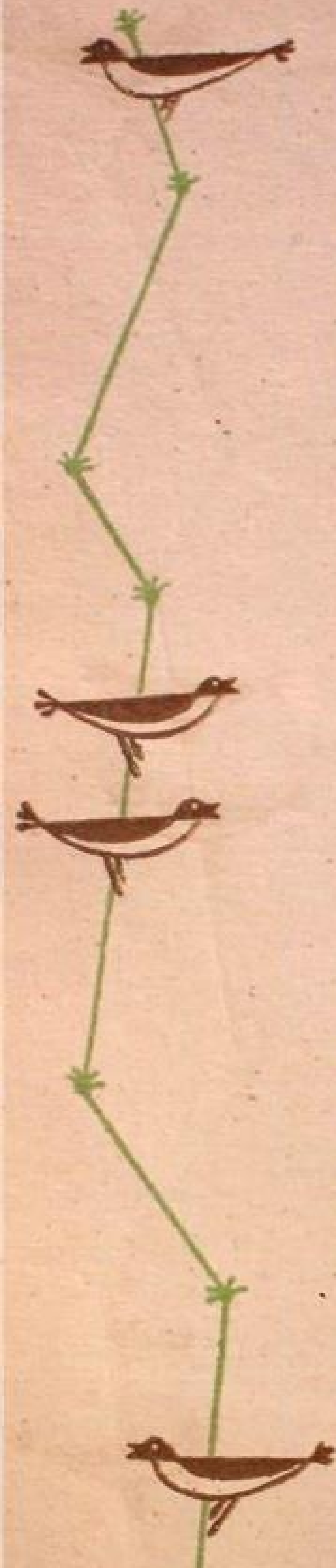

بھیگی بھیگی رات میں ، تاروں کی نیچی ھے نگاہ
چاند چھپ جائے گا شاید ، روشنی کم کم ھوئی
اشک آنکھوں میں چھلکتے آرھے ھیں اس طرح
میرے شانوں پر ترے بالوں کی ھر لٹ ، نم ھوئی !

اور یه سرگوشیاں کہتی ھیں — وہ باتیں گئیں !
شہر و صحرا ، خونِ ناحق سے رھیں گے لاله گوں
زندگی بے مایه ھے جیتیں گئیں ، ماتیں گئیں !
آج اک عالم کو پاگل کرچکی ھے بوئے خوں
سروری کرتا ھے بے مقصد تباھی کا جنوں
نسلِ انسانی کی جیسے حسرتِ دل ھو یہی
علم و حکمت اس طرح ھیں اس کے آگے سر نگوں
جیسے ان صدیوں کی جانکاھی کا حاصل ھو یہی
آدمی کے ارتقاء کی جیسے منزل ھو یہی !

ماند پڑ جائے گا تاروں کا یه اجلا پن ابھی
ھو چلی ھے خسته ساماں ھلکی ھلکی چاندنی
شبنمی خنکی سے بوجھل ھوتی جاتی ھے صبا
دیکھتے ھی دیکھتے ، ھر شے سے ڈھلکی چاندنی !

اور اب دل کی تڑپ کہتی ہے — یہ دنیا بھی کیا
کیسی بے نظمی سے ہوتی ہے یہاں جینے کی بات
ساز و ساماں چاہتا ہے موت کا سودا ہی کیا ؟
بے گل و بے شمع کٹتی ہے یہاں ہستی کی رات
یہ سسکتی زندگی جیسے فنا کی ہو زکات
جس کے چھن جانے پہ ہم جب تک جئیں ڈرتے رہیں
اس پہ یہ طرّہ کہ جب تک دن کے بعد آئے گی رات
ہم ہی آپس میں کہیں ماریں، کہیں مرتے رہیں
جیتے جی یوں موت ہی کی چاکری کرتے رہیں

اب افق پر ہوچلا، سہمی سپیدی کا ظہور
اور افق کے اس طرف، اک دوسری دنیا کی شام
ڈوبتے تاروں کو بلوانے لگی اپنے حضور —

اور تم میرے خمِ بازو میں سوئی ہو ابھی
اور تم میرے خمِ بازو میں سوئی ہو ابھی

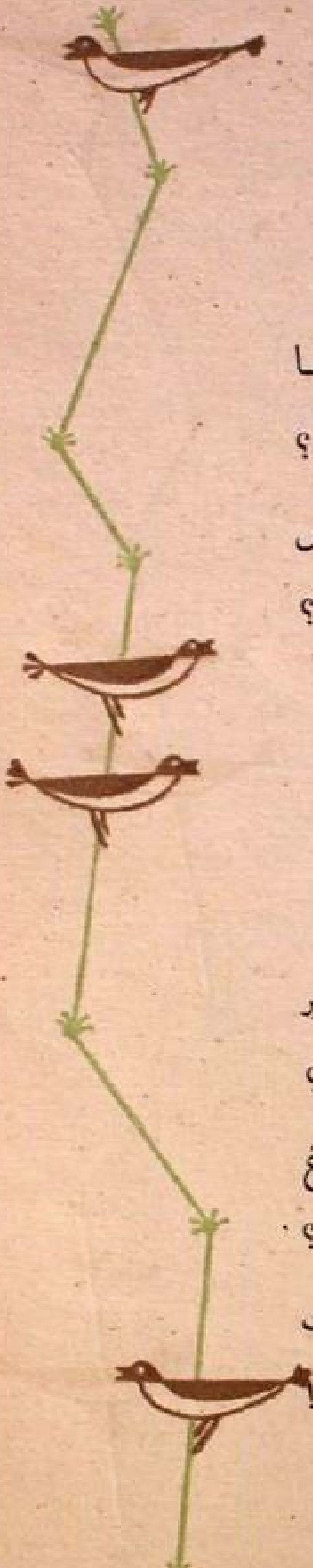

اے اسیران قفس !

ٹوٹی دیواروں کا یہ زنداں ، کھنڈر ہو بھی تو کیا
اپنے زنجیر و سلاسل چھوڑ کر بھاگے گا کون ؟
ان سے وابستہ ہے صبر و اجرِ مظلومی کی آس
ان کی دل سوزی سے ناطہ توڑ کر بھاگے گا کون ؟

اپنی زنجیروں کے ایسے ناسزا غم کے اسیر
جی رہے ہیں جیسے ہم ، انسان جی سکتا ہے کیا ؟
جس سے ہوں مفلوج ، ایسے نیم زندوں کے دماغ
دیکھتی آنکھوں کوئی وہ زہر پی سکتا ہے کیا ؟
اور — ان حالوں ، خموشی سے کہیں بہتر ہے موت
لاکھ قدغن ہو ، یہ انساں ہونٹ سی سکتا ہے کیا !

لبِ ساحل

اور پھر ، بے مہریِ اوقات کی باتیں چلیں —

ساحلِ سنگیں سے زچ ، بپھری ہوئی موجوں کا زور
چاندنی ڈھلکی ، تو جیسے ہوگیا ، یکسر نڈھال
ہلکی ہلکی روشنی میں گھل گئیں تاریکیاں
جھاگ نے واماندہ لہروں کے لئے پھیلائے جال

دیر تک یوں تلخیِ حالات کی باتیں چلیں :

« قدرِ قدرت کچھ بھی ہو انسان کی ہستی نہیں
ہم تو بے حاصل مشقت ہی کریں ، کرتے رہیں
بے زبانہ زنگی غلاموں کے گروہوں کی طرح
نارسا آقاؤں کی خاطر مریں ، مرتے رہیں »

موجیں تھک کے ہٹی جاتی تھیں ساحل سے پرے
اور سیہ ننگی چٹانیں ، اپنی سنگینی کے ساتھ
ھانپتے ریلوں کی لائی ریت ، قدموں میں لئے
پھر بڑھاتی تھیں سمندر کی طرف سایوں کے ہاتھ

گفتگو کی رَو میں پھر دن رات کی باتیں چلیں —

«یہ مشقت چار دن کی زندگی کا ہے صِلہ
آپ ہم جس میں ہنسیں بولیں کہ دُکھ سہتے رہیں
دَور یہ ہے اتنا ، بے اقدار ، ایسا ناسزا
جس میں سب موقع پرستی کے سہارے جی سکیں»

•

دُور تک ، پھیلے سمندر پہ کوئی ہلکی سی رَو
گہرے ساکت پانیوں کو ایسے تھپکاتی رہی
جیسے طوفانوں کے مد و جزر کا سویا خروش
اپنے جیتے جی تو شاید پھر نہ جاگے گا کبھی !

•

یک الف بیش نہیں ....

اتنا دشوار نہیں، صاحبِ فردا بننا
شاکیٔ حال سدا اہلِ نظر کہلائے
پیشگوئی کا جُوا، جب بھی کسی نے کھیلا
اس کی تصدیق کو حالات دلیلیں لائے
جس نے انساں کو زبُوں حال، نگوں سار کیا
کل کی عظمت کے لئے اپنے چلن سمجھائے

نسل در نسل چلا ھے یہ طلسمِ فردا
خیل در خیل پرکھتا رھا عظمت کے چلن
کبھی موعُودہ زمینوں میں سماوی انعام
کبھی سرسبز چراگاھوں میں نورِ ایمن
کبھی انساں کی ترقی کے نئے منصوبے
کبھی اقدار کو یکسر ھی بدلنے کے جتن
کبھی افراد کا کردار، ترقی کا نصاب
کبھی افراد، جماعت کے ثمر کے رھزن

یعنی تاریخ کے ہر موڑ پہ جانا ہم نے
خاکبازی میں نواساز ہی رہنا ہوگا
اور ہر اہلِ نظر ، صاحبِ فردا کے طفیل
ابھی ، زندانیِ آغاز ہی رہنا ہوگا

غزل

اک عمر سے اس لئے ہیں بے چین
کیا چیز ہو کس طرح ملے چین

اس پھیر سے کون بچ سکا ہے
بے چین ہیں سب کہ مِل سکے چین

کچھ دیر کو جی بہل گیا تھا
ورنہ تیرا درد اور دے چین

کیا جبر کے دُکھ کی بات کیجے
کیا مل گیا اختیار سے چین

کب تک دمِ واپسیں کی یہ قید
مختار ہے اب بھی دے نہ دے چین

ایک نظم

(۱)

برستی رات کی رِم جھم ، اداس تنہائی
ہوا کے ھانپتے جھونکے نمی کے بوجھ سے چُور
اندھیری اندھی فضاؤں میں کوئی پاس نہ دور

نہ چاند ہے نہ ستاروں کی چشمکیں باقی
نِگہ اجاڑ ہے مانگے کا نور بھی نہ رہا
یہی سہارا تھا اس کا ظہور بھی نہ رہا

گھٹائیں کُھل کے ھی برسیں نہ کچھ برس کے کُھلیں
کسی طرح بھی یہ بھیگی سیاہیاں نہ دُھلیں

(۲)

کسی صدا سے نہ گونجے گی آج مہتابی
نہ سہمے قدموں کے کھٹکے پہ چھاگلوں کی چھنک
نہ تھرتھری پہ کبھی چوڑیوں کی نرم کھنک

نہ تیز سانسوں کی رکتی لپک پہ خاموشی
سمٹنے پائے گی ، پل بھر کو جیسے آج کی رات
کسی کے لب پہ نہ آئے گی آج لاج کی بات

خدا ہی جانے کہ اس کی سحر بھی ہوگی کبھی

برف باری کی ایک رات

(۱)

شام ہوتے ہی پھرنے لگا، یخ بستہ ہوا کا طوفان
اور پھر برف کی زرہوں میں چھپی وادیوں کہساروں پر
چھا گیا ہونکتی، غُراتی ہواؤں کا جنوں

سر برآوردہ اٹل چوٹیاں مضبوط تناور دیودار
کانپ کانپ اٹھے — کہ جناتی ہواؤں کا یہ اندھا لشکر
اب کی یلغار میں کس کس کو کرے خوار و زبوں

(۲)

جانبِ غرب سے پھر اٹھی وہ مٹیالی غضبناک اکیلی بدلی
حاشیے پر کی چمکتی ہوئی جدول میں عجب شان کی وحشت خیزی
خوف سے ابر بھی طوفانی ہوا بھی سمٹی
خوف سے ساری فضا گُنگ ہوئی!

چار سُو چھا گیا بے پایاں خموشی کا فسوں
ہانپتی سرد ہواؤں میں گھُلے سناٹے
وادیاں، دامنِ کہسار، تناور دیودار
دم بخود ہوگئے، لہرا کے جو کوندے لپکے

(۳)

اور پھر کُھرے امڈنے لگے اور برق ہوئی نعرہ زناں
آن کی آن میں چاندی کی سبک تتلیاں، سیماب کے نازک پارے
وادیوں چوٹیوں چیلوں پہ گرے۔ گرتے رہے!

پھر ہر اک سمت یہی بانکی پھواریں، یہ سجیلی یہ رُوپہلی بارش
گھرے سناٹوں کی مخمور سی گرمی میں یہ مرمر سے تراشے تارے
ہانپتے جھونکوں کے شانوں سے اتر کر برسے
وادیوں چوٹیوں چیلوں پہ گرے۔ گرتے رہے!

(٤)

صبح ہونے پہ تھی آن دیکھی تجلّی کی ہر اک سمت منزّہ تابش
بے اماں عصمت و تقدیس میں انگڑائیاں لیتا ہوا حُسن!

حکمراں چار سُو، بے پایاں جنوں خیز جمال!
خِیرہ کُن، نورِ سماوات سے لبریز، جمال!!

سحر سے پہلے

شام کی گہری اداسی تو نئی بات نہ تھی
عالمِ ہُو کی ہے آواز فسانہ دل کا
بے دلی کے لئے ارزاں ہے بہانہ دل کا
بے کلی، پہلے ہی شرمندۂ اوقات نہ تھی
— اور اب آئے پریشان خیالوں کے ہجوم
سر پہ رات آئی ہے پھر، دیکھئے اب کیا ہوگا!

چاند نکلا ہے، ادھورا نہیں، پورا نہ سہی
اب خلش اوج پہ ہے، اب تو کتاں ہے سینہ
گھاؤ لَو دیتے ہیں یوں شعلہ بجاں ہے سینہ
قصّۂ خوںِ جگر، عبرتِ افسانہ سہی
پھر بھی یادوں کے طلسمات سے مبہوت ہے دل
دل — کہ فرزانۂ غم ہو کے بھی، دیوانہ سہی

خامشی اب تو نوا بن گئی سُونے پن میں
آرزو دستِ دعا بن گئی سُونے پن میں
وہ دعا جس کے لئے بابِ اثر وا نہ ہؤا
نارسائی میں خدا بن گئی سُونے پن میں

یعنی اب تک مری جانکاہ تگ و دو تھی یہی
کچھ سرابوں کی کشش ، میرے خرابوں کی امیں
ان سرابوں ، انہی بے نام خرابوں میں کہیں
ماضی و حال کی وہ «منزل فردا» نہ ملی !

جاگتے جاگتے آ جاتی ہے پچھلی شب بھی
تیر تیر اٹھتے ہیں آنکھوں میں جلن کے لہرے
مضمحل نیند ہے آنکھوں میں پریشاں — تب بھی
کتنی یادوں کے ، خیالوں کے ہیں دل پر پہرے !

اور اس طور گزر جاتی ہے ہر رات یہاں
روز بن بن کے بگڑ جاتی ہے ہر بات یہاں
آنکھیں مُند جاتی ہیں آثارِ سحر سے پہلے
درد بنتا ہے دوا ، آپ ، اثر سے پہلے !

•

« رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں !
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں !! »

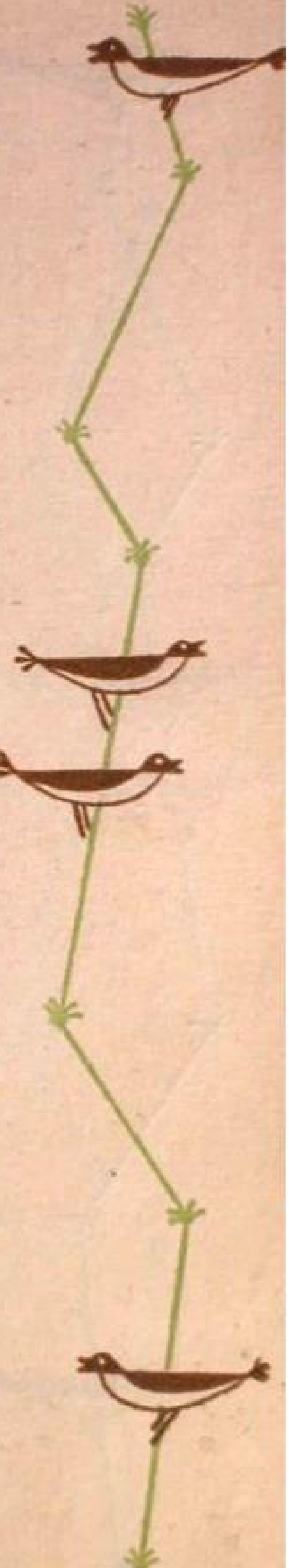

غزل

اب سرِ سرو و سمن ہے کس کو
چھوڑو بھی، فکرِ چمن ہے کس کو

اپنے دم تک ہیں وفا کے چرچے
پاسِ ناموسِ کہن ہے کس کو

کس میں ہے جرأتِ بے جا کی مجال
ہوسِ دار و رسن ہے کس کو

بات کیا، چُپ بھی ہوئی جرم یہاں
بولو اب تابِ سُخن ہے کس کو!

کون اب شعر کہے، رُسوا ہو
ایسی ہی الفتِ فن ہے کس کو!

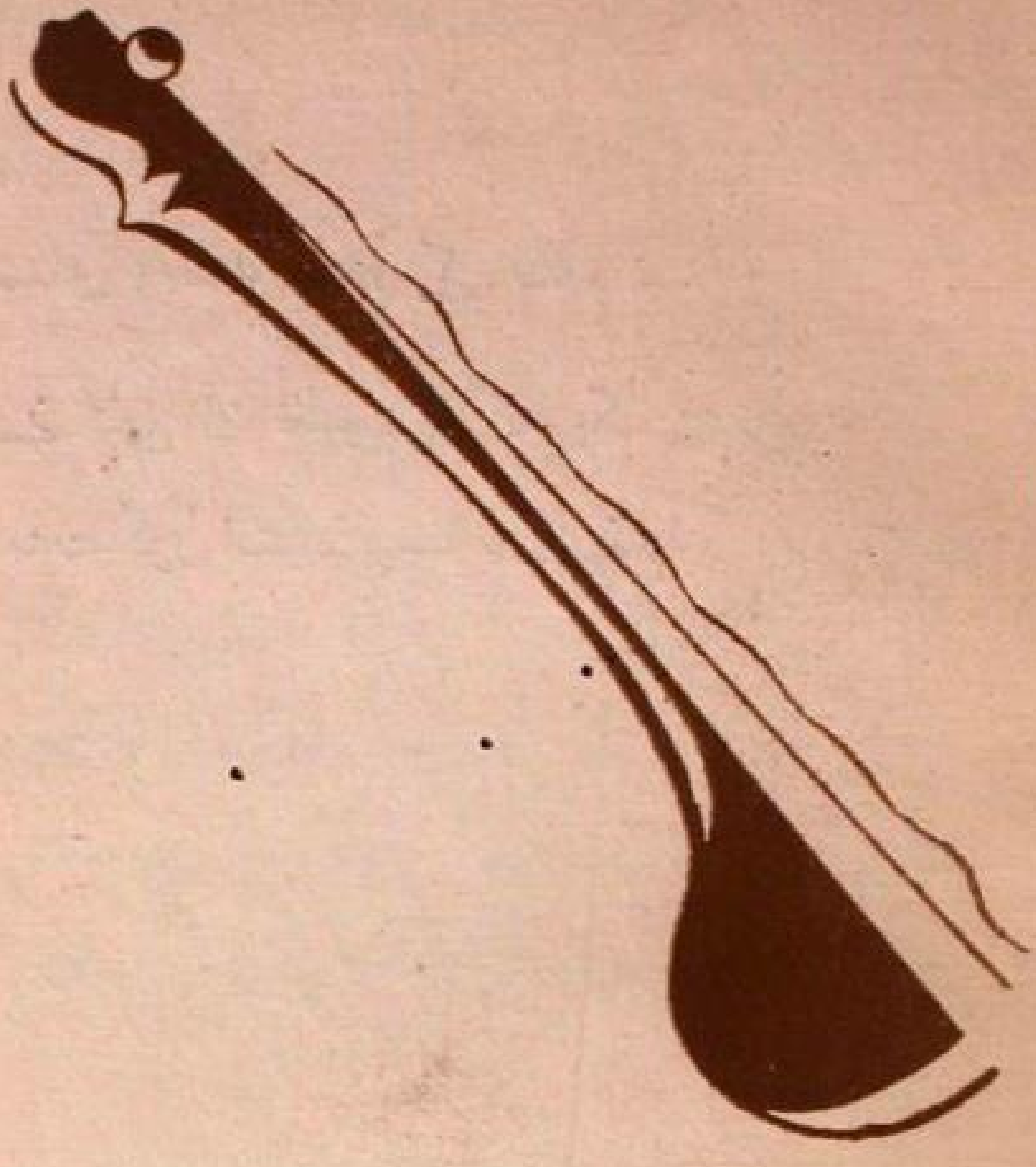

سدا رنگ

مرحوم مشتاق احمد شیخ کے نام —

جنھوں نے کبھی ان نظموں کی تحریک کی تھی

پس از مدت گزر افتاد برما کاروانے را

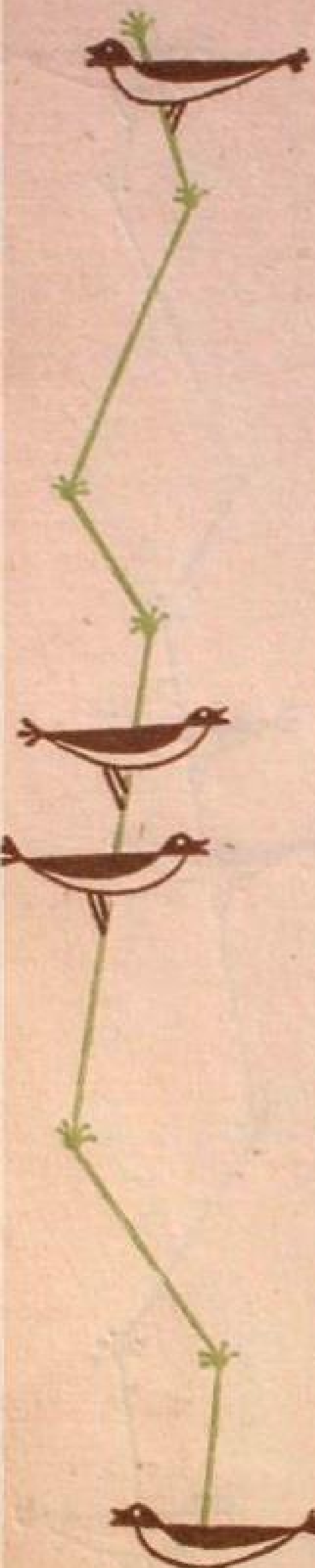

نغمے سے آگے

(سرگم)

لب پر آ جاتے ہیں سنگیت سہارے ساقی
ولولے دل کے اگر غم سے سنورنا سیکھیں
وہ زباں — جو ہے شفق ، پھول ستارے ساقی
ہم بھی پالیتے ہیں گر زندگی کرنا سیکھیں

بات بن جاتی ہے ترکیب سُروں کی ساقی
ہر تأثر سے نئے روپ میں ڈھل جاتی ہے
پھر کوئی بات نہیں رہتی ہے باقی ساقی
اور ہر بات پہ ترکیب بدل جاتی ہے

ایسے جذبوں کی اٹھانیں بھی یہیں ہیں ساقی
لفظ و معنی کے طلسمات سے جو ہیں آگے
اُن خیالوں کی اڑانیں بھی یہیں ہیں ساقی
یوں ، کہی اَن کہی ہر بات سے جو ہیں آگے !

نازک احساس کی رنجوریاں ساری ساقی
اور طنّاز تمنّا کے تقاضوں کی چُبھن
نئے ارمانوں کی وہ لاگ ہٹیلی ساقی
اور وہ سانجھ سویرے کی دعاؤں کا چلن

روز و شب روتے ہوئے دل کی پکاریں ساقی
رُت کے گہواروں میں پلتے ہُوئے لاکھوں فتنے
اور یہ سُجتی سنورتی ہوئی ناریں ساقی
جن کی سرمستی و رعنائی کے پہلو اترے !

یہ سُریں رکھتی ہیں ایسے کئی عالم ساقی
وہ بھی ہیں جو کسی تخلیق کی حد میں بھی نہیں !
ہے وہ پہنائی لچکتی ہوئی سرگم ساقی
وسعتیں جس کی ازل کیا ہے ابد میں بھی نہیں !

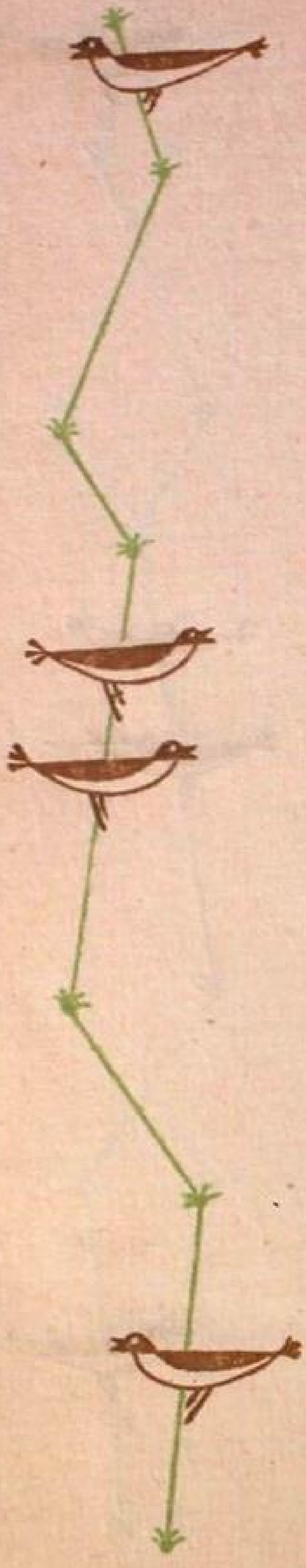

خیال ایمن کلیان

بلمپت :—

دوڑتے جاتے ہیں ہر سمت دھندلکوں کے نقیب
سرمئی دُھول میں ہر شے ہے نہ پنہاں نہ عیاں
بیکراں سائے گُھلے جاتے ہیں سنّاٹے میں
کوئی تارا بھی ابھی نکلا نہیں — چاند کہاں !

اُف یہ بے پایاں سیاہی کی تہوں کی ترتیب
کشتِ مغرب کے کھلے پھول نہ یوں کمھلائیں
کوئی تارا بھی نہیں ، چاند نہیں ، وہ بھی نہیں !
اِن اندھیروں سے کہوں ، اَب تو سجن گھر آئیں
غم کی ماری کو نہ یوں ترسائیں
اب تو سجن گھر آئیں !!

کاکلُیں کھول کے بالوں کو جھٹکتی ہوئی شام
مجھ سے کہتی ہے کہ میں ہوں ، تو کہیں رات نہ دن !
شب کی وسعت میرے سینے کے خلا سے لپٹی
اے ری آلی نہ پڑے چین مجھے تو پی بن
بے کلی ڈستی ہے پل پل ، چِھن چِھن
اے ری آلی پی بن !

حلقه در حلقه سیاهی ، وه هوئی پا بر کاب
کروٹیں لیتا ہے ہر سمت اندھیروں کا سراب
اے ری آلی یہ اندھیروں کا سراب !
چار آنکھیں کبھی ان سے نہ کرے گا مہتاب
اُف خلاؤں کا یہ رقصِ بے تاب
کیسی بیتابی انہیں ڈستی ہے پل پل — چھنِ چھن
اے ری آلی نہ پڑے چین انہیں بھی پی بن
اے ری آلی پی بن .

دُرَت :—

چَھٹ گئی تاروں کی افشاں تو پیا گھر آئے
مورے پیا گھر آئے
اب کسی وعدے کی الجھن نہ ہمیں تڑپائے
مورے پیا گھر آئے
آ گئے مورے پیہروا میں گئی بلہاری — !
نیک نجر پر واری
اب کسی وعدے کی الجھن نہ ہمیں تڑپائے
مورے پی آئے، میں اولادِ علی ، آلِ نبی پر واری
آلِ نبی پر واری

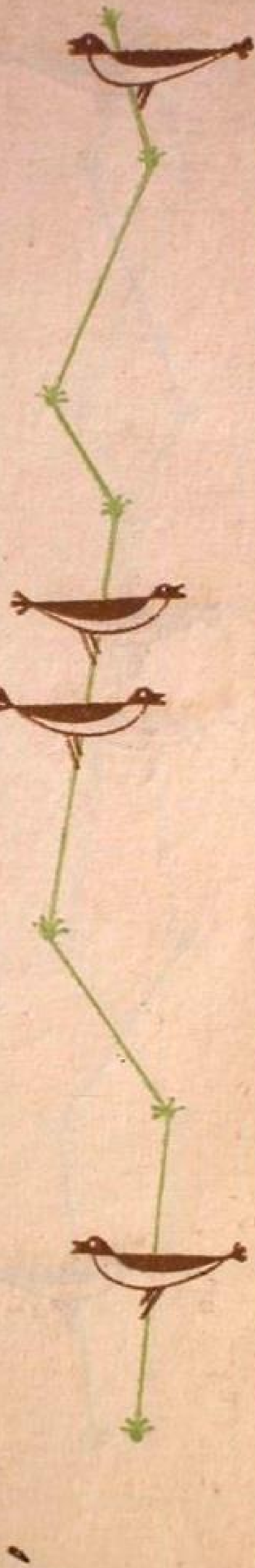

خیال درباری

اِن کے گانے میں ہے پرکاش ذرا دیکھو تو
ایک اک تان سے ہیں نور کے سوتے جاری
تین صدیوں کے شب و رُوز جلو میں لے کر
سیکڑی لائی ہے گمبھیر، سجل درباری:

یہ در و بام ہیں ساونت مُغل کا پَرتو
ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں سنگینی
اونچی محرابوں کے گھیرے میں کشادہ ایوان
جس نے بیباک ارادوں سے بلندی چھینی!

اسی ایوان میں ہے اکبرِ اعظم کا جلوس
سونے چاندی کے ستاروں سے چھتیں ہیں آکاس
اَن گنت جھاڑ، دمکتی ہوئی لاکھوں شمعیں
خلعتیں جن کی ہیں بلّور کے شفاف لباس

اھلِ دربار ! خبردار نگاھیں نیچی !
ان صداؤں میں وہ ھیبت ھے کہ دل تھرّائے
ھات باندھے ھیں حضوری میں امیرانِ کبیر
آئی آواز — کہ تشریف شھنشہ لائے
حضرتِ گیتی پنہ اکبرِ اعظم آئے !
کوئی نظریں نہ اٹھانے پائے !
اکبرِ اعظم آئے !!

استھائی :—

تُرکماں حجرتِ اکبر آیو !
اُپ بلی ، تپ بلی ، دنیا میں خدا کا سایہ
جن کا دم بھرتا ھے انسان ، ملک ، چوپایہ
ان کے ھم آپ نہ بل بل جیئے ؟
مرنے جینے کا اگر اِن سے بندھنوا باندھو
پار بیڑا ھو کہ ھے پیر ھمارا سانچو !
ترکماں حجرتِ اکبر آیو ! — حجرتِ اکبر آیو !!

انـــتره :ـــ

آلِ تیمور کے سورج کی تجلّی پھیلی
دُکھ دلِدّر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھاگے
وہ اجالا ہے کہ جُگ جُگ کے نصیبے جاگے
اے ری جُگ جُگ کے نصیبے جاگے !
دو جہاں مطلعِ انوار ہوئے ہیں ـــ دیکھو
ترکماں حجرتِ اکبر آیو ـــ حجرت اکبر آیو !!

پھیــلاؤ :ـــ

روشنی تیز ہوئی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی ، فانوسوں کی
روشنی تیز ہوئی ، شمعوں کی ، فانوسوں کی اور شب
کی دُلہن
روشنی تیز ہوئی ، شمعوں کی ، فانوسوں کی اور شب
کی دُلہن شرمائی
روشنی تیز ہوئی ، شمعوں کی ، فانوسوں کی اور شب
کی دُلہن شرمائی ، لجا کر سمٹی

روشنی تیز ہوئی ، شمعوں کی ، فانوسوں کی اور شب
کی دُلہن شرمائی ، لجا کر سمٹی ، سمٹ کر بیٹھی
انہی شمعوں نے دیا چاند کا جھومر اس کو
دو جہاں مطلعِ انوار ہوئے، دیکھو تو
ترکمان حجرتِ اکبر آیو — حجرتِ اکبر آیو !!

جوت گانے کی بجھی ، بیتے زمانے بھاگے
کھینچ لیں تین سو برسوں نے طنابیں اپنی
قصرِ ویراں میں کہیں بُوم کا نوحہ گونجا
سونپ دیں راگ نے اس نوحے کو خوابیں اپنی !

بیکراں رات سے محراب کی رفعت دُونی
اور میں سایۂ محراب میں ہوں افتادہ
خشک خندق سے اُدھر کوہِ گراں دیواریں
اب کہاں جاؤں کہ رہبر نہ نشانِ جادہ

کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری ؟ !

ایمن کا ایک اور روپ

اب تو بُجھ جانے کو ہے شام کی جلتی کایا
بڑھتا آتا ہے دھندلکوں کا گدازِ رنجور !
پھیلتے سایوں سے ٹکرا کے نگاہیں پلٹیں
اب کسے دیکھیں سیاہی میں کوئی پاس نہ دُور
نیلے سُرمے کی اُمنڈ آئی ہے گہری چھایا
مٹی لالی کو دُھواں چھوڑ کے آہیں پلٹیں !

سر پہ رات آئی تو یوں گُنگ ہوئی مہتابی
دن ہی اس زیست کے نغموں کا خدا ہو گویا
اب وہ کھڑراگ فنا ہوگیا سنّاٹے میں
یوں مٹا ہے، کبھی پیدا نہ ہؤا ہو گویا !
اب کوئی ڈر، کوئی کھٹکا نہ رہے گا باقی
دن کا غمّاز، کہیں کھوگیا سنّاٹے میں

اب ہے کیا دیر ؟ کوئی سوچ قدم کیوں روکے ؟
کوئی بجرا کوئی کشتی نہیں بارِ دریا
نیم بے ہوش ہوئیں دن کی تھکن سے لہریں
سو چلا رات کی گودی میں فشارِ دریا
نیّا باندھو رے کنارِ دریا !
باندھو کنارِ دریا !

بھلاوہ :—

دیر کیا آؤ بھی نیّا باندھو
رات خود اوٹ ہے اب آؤ بھی نیّا باندھو
دیر کیا رات ہی خود اوٹ ہے اب آؤ بھی نیّا باندھو
دیر کیا آؤ بھی نیّا باندھو !
نیّا باندھو رے کنارِ دریا — باندھو کنارِ دریا !!

انترہ :—

گر میں ہوتی وہ جواں بخت پرانا برگد
جس سے تم باندھتے دریا کے کنارے نیّا
یا تمہیں ہوتے سجن میرے گلے کی کنٹھی
میری بِندی ، میری آنکھوں کا رسیلا کجرا
شام کی راہ پہ ہر آہ نہ کہتی پھرتی :
رازداں تیرگی ہوتی ہے نشارِ دریا
نیّا باندھو رے کنارِ دریا !
باندھو کنارِ دریا !

پھیلاؤ :—

پیا آنے کو ہیں شمعیں کرو روشن ، سکھی اُٹھو میرے گہنے لاؤ
موتیوں سے مرے جُوڑے کو سجاؤ، نئی راتیں ہیں نرالا چاؤ
بدھیاں بیلے کی زرتار سکھی ساتھ مرے گندھواؤ
مانگ صندل سے بھرو ، آؤ پنہاؤ گجرے
اے سکھی آؤ پنہاؤ گجرے !

•

نیّا باندھو رے سجن اب تو کنارِ دریا !
باندھو کنارِ دریا !

دونوں وقت آن ملا کرتے ہیں دم بھر کے لئے
ورنہ دنیا کی یہی ریت ہے بچھڑے نہ ملیں
رات تو راگ کے بیراگ میں کٹ جائے گی
چاک اُجالوں کے مگر ان سے تو شاید نہ سِلیں؟

نیّا جیون کی نہ آجائے کنارِ دریا ؟ !

خیال چھایا

بلمپت کا مکھڑا :—

رات میں کیسے رچی ہے میری رنجوری کی لاگ
نیم جاں ہے آج ارمانوں کی ہم سِن چاندنی !
نرم جھونکے بُن رہے ہیں بے سبب آہوں کے جال
جن میں گھُٹ گھُٹ کر رہی جاتی ہے کم سِن چاندنی
ملگجی چھایا ہے کس سنجوگ کی یادوں کا سوگ
یوں بروگن بن گئی ہے آج کس بن چاندنی ؟

بروگ رس :—

آج یہ حسرت بھرے گیتوں کی برھن چاندنی
میرا پیکر میرا تن من چاندنی
دیکھتی ہے جی کو سہماتے ہیں کیا کیا وسوسے
کیسے دھڑکے ہیں کوئی نیور کی جَھن جَھن سُن نہ لے
کوئی اس نیور کی جَھن جَھن سُن نہ لے !

بھیگتی ہے رات سنّاٹوں کے گہرے سوز میں
میں ہوں مہتابی کا سُونا پن ہے ، اندیشوں کے غول
کیسی تنہائی ہے — جس کی تلخیِ دل دوز میں
جی کی بے چینی سے نادم ہے جئے جانے کی بھول
دُور تک پھیلے ہوئے سبزے پہ شبنم ہے نڈھال
بڑھ چلا ہے سَرُو کی تاریک پرچھائیں کا طول

.
.

اور محرابوں سے آن دیکھے گزر آیا ہے یہ ہلکا گداز
دیکھتا ہے بڑھ کے خالی سیج کی کلیوں کا رنگ
جن کی اٹھتی باس پر جی کی امنگ

پی سے ملنے کے سجھائی تھی نرالے راستے
پھر ڈراتی تھی — کوئی نیور کی جَھن جَھن سُن نہ لے
کوئی اس نیور کی جَھن جَھن سُن نہ لے !

.

اب تو مہتابی کے ہر گوشے میں ہے پیلی اداسی کا وفور
ادھ جلی شمعوں پہ، بسرائے ہوئے گہنوں پہ، ہر شے پہ، اسی کا ہے ظہور !
رات کی بڑھتی ہوئی خاموشیوں میں دل دھڑکنے کی صدا
میری بیرن — گونج اٹھتی ہے سنّاٹوں کے بل پر دُور دُور!
اب نیا ڈر ہے — کوئی اس دل کی دھڑکن سُن نہ لے!
اب کوئی اس دل کی دھڑکن سُن نہ لے!

دُرت کا مُکھڑا :—

دھڑکنیں اب تیز تر ھیں ، لے بڑھے سنگت کرے
وجد میں ھے راگنی سے جھومتی نبضوں کی چال
نیم قد ھے ملگجا مہتاب ، تارے شوخ شنگ
اس نرالے ھجر کے انجام کا آیا خیال !

شانت رس :—

کن ھواؤں کے سُبک شانوں پر آئی یہ صدا :

میری رانی آؤ بھی
میری پیاری ، میری راتوں کی نویلی چاندنی !
میری رانی آؤ بھی
آؤ ھم سے اس انوکھے لاڈ کی گھاتیں کرو
چاھتوں کے رس میں ڈوبے ناز کی باتیں کرو !
میری رانی آؤ بھی
گھر کے آنگن سے کہاں جائے تری یادوں کی باس
میرے چاند آؤ رچاؤ ساری سکھیوں سنگ راس
میری رانی آؤ بھی

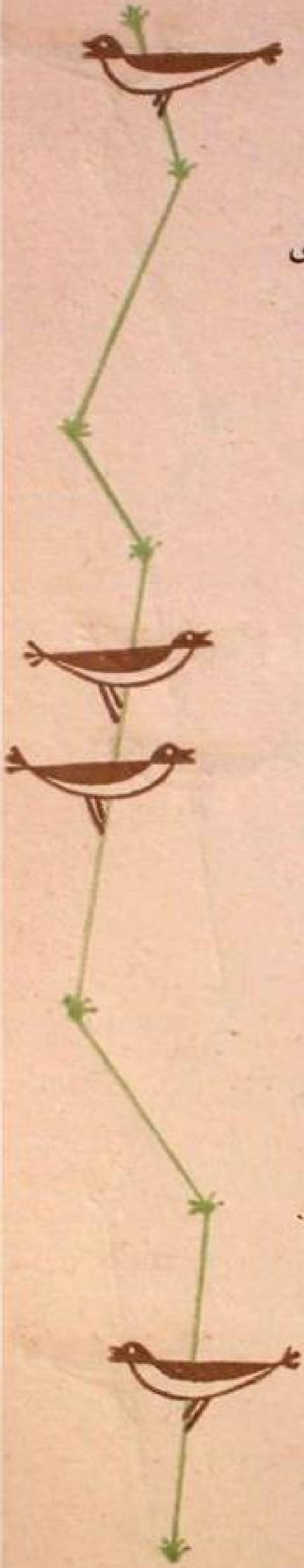

جی کے شیتل گات میں اک اک سجیلے انگ میں !
ہوں سدا رنگ اب رنگیلے پریت کے رس رنگ میں !

میری رانی آؤ بھی
میری پیاری میری راتوں کی نویلی چاندنی !

کیدارا کا ایک روپ

[کیدارا چاندنی رات کا راگ ہے جس میں بنیادی جذبہ ، شکایت ہے ، اس کی پیش کش میں حسن ترکیب (سنگار رس) کا خاص خیال رکھا جاتا ہے]

رات بھیگی ، اوٹ سے کُہسار کی نکلا ہے چاند
چاک دامانوں کے سینے بھی کتاں ہوں گے ابھی !
کھلتی رُت کے نرم جھونکوں کو تھپکتا ہے سکوت
مٹتے تارے جگنوؤں کے ارمغاں ہوں گے ابھی
سوز غم میں بس چلی ہیں ، سیم بر رعنائیاں
دل کے ارماں داستاں در داستاں ہوں گے ابھی

الاپ :—

اور سیمائے جہاں کا اب تو دل ہے چاندنی
دم بخود پیڑوں کو ، ساکت جھیل کو ، بیگانہ سبزے کو ہے
مدھوشی کا ساماں چاندنی
رات کی رانی کی متوالی ، گھنی خوشبو کو مخموری کا عنواں چاندنی
شہر و صحرا میں بھٹک کر مُضمحل ہے چاندنی !

اور — نینـــدوں کی گراں باری میں آسودہ ہوئی ہے
خستہ ساماں چاندنی
اس خموشی کے فسوں، پھیلے سکوں کی اب ہے گویا،
جان جاناں چاندنی !!

•

استھـائی :—*

••

آج سب مبہم امنگیں، گنگ شکووں میں نہال
چاند نے چھینا ہے، ارمانوں کے منہ سے یہ سوال:
ہم تو محرومی کی راہیں تکتے تکتے مر چلے
منتظر ہے کون؟ جاناں تم جو بن ٹھن کر چلے!
جاناں تم جو بن ٹھن کر چلے!

اجڑے اجڑے دن، اندھیری کور راتیں بھی وبال
چاندنی کے کھیت میں بھی حال تجھ بن ہے یہی
کوئی رُت ہو، ہم ہیں اور یہ خود کلامی کا عذاب!
جیسے ان حـالوں جئے جانے کا ضامن ہے یہی
ہم جو ہیں مجبور، یـہ بھی خوبیٔ تقدیر ہے
تم گریزاں ہو، گریزو نـاز کا حِسن ہے یہی !!

* اس سارے بند میں، سا، ما کی سروں یعنی ان آوازوں کا خاص التزام کیا گیا ہے۔

پھیلاؤ :—

اور اب ، پیڑوں کی اونچی کونپلیں بھی ہو رہی ہیں زرنگار
چاند اوجِ آسماں پر آچکا ، ہر شے ہوئی آئینہ زار
سائے سمٹے ، شاخوں اور پتّوں سے چھنتی آرہی ہے چاندنی
حسن کی زہرہ وشی کا روپ ، بے مہری کا رنگ ناز ، بنتی
جارہی ہے چاندنی
ہم اسی عالم میں محرُومی کی راہیں ، تکتے تکتے سو چلے !
منتظر ہے کون ، جاناں ، تم جو بن ٹھن کر چلے !
جاناں ، تم جو بن ٹھن کر چلے !!

بوئے رفتہ

(غزلیں)

باتیں ہماری یاد رہیں ، پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک ، سر دُھنیے گا
سعی و تلاش بہت سی رہے گی ، اِس انداز کے کہنے کی
صحبت میں علما فضلا کی جاکر پڑھیے گُنیے گا

میر

☆

جو جو صدمے ہم پر گزرے، کیسے ان کا بیان کریں
کون سا داغ نکال کے دل سے ثبت سرِ دیوان کریں

ہم پر تہمت رکھیں، ان کے باب میں کوئی گمان کریں
یاں پہ فرشتے دخیل نہیں ہیں جو بھی کریں انسان کریں

آٹھ پہر آشفتہ خیالی کس کو بھلا خوش آتی ہے
جی مانے تو ہم بھی کچھ دل جمعی کا سامان کریں

ہم مجبور سدا سے رہے ہیں اپنے مزاج کی وحشت سے
کر پائیں تو دنیا داری ہم بھی ہر عنوان کریں

جب سے قفس کا گوشہ چھوٹا ایک ہی دُگدا رہتی ہے
جینا مشکل مرنا مشکل، کیا مشکل آسان کریں

یار احباب نہ جانے کیوں اِن روزوں ہم سے گریزاں ہیں
دشمن ہی اب حال پہ اپنے شاید کچھ احسان کریں

☆

ڈھب دیکھے تو ہم نے جانا، دُھن بھی من میں سمائی ہے
«میراجی دانا تو نہیں ہے، عاشق ہے سودائی ہے»

کیا کیا پہلو سامنے آئے کیسے کیسے جذبوں کے
دل کی بے چینی نے دل کو کیا کیا بات سُجھائی ہے

رات بہت بے حال رہے ہیں، بھولی بسری یادوں نے
اک ایک گھڑی بے خوابی کی کن جتنوں سے بہلائی ہے

دم میں غبارِ خاطرِ صحرا، دم میں باغ بہاراں ہیں
دیوانوں نے تیرے عجب وارستہ طبیعت پائی ہے

ساتھ جنابِ نظر کے پھر سے، بھایا رنگِ میر ہمیں
جانے وحشتِ دل اب ہم کو کون مقام پہ لائی ہے

☆

شکر کرو آدابِ جنوں میں فطرتِ عالم طاق ہوئی
ہوش و خرد کی ہر پابندی بوسیدہ اوراق ہوئی

دل کو ٹٹولیں ، کھوجائیں کن یادوں کی رنگینی میں
یاد یہی ہے بہار و خزاں : جو آئی سو، شاق ہوئی

میل ملاپ کی باتوں میں اب سوچتے ہیں دلچسپی لیں
شاید یہ معلوم ہو کیوں کر ہم کو خُوئے فراق ہوئی

دل کی گہری چُبھن کے کیا کیا پنہاں پہلو پیدا ہیں
بھید کی بات غزل کے دم سے کیا شہرہ آفاق ہوئی

☆

آخر دل کی پرانی لگن کر کے ہی رہے گی فقیر ہمیں
ہر رُت آتے جاتے پائے ایک ہی شے کا اسیر ہمیں

دھوم مچائے بہار کبھی، اور پات ہرے کبھی پیلے ہوں
ہر نیرنگیٔ قدرت دیکھے، یکساں ہی دل گیر ہمیں

کیا کیا پکاریں سسکتی دیکھیں، لفظوں کے زندانوں میں
چپ ہی کی تلقین کرے ہے غیرت مند ضمیر ہمیں

جن کی ہلکی گہری تلخی، خون میں رچ رچ جاتی ہے
جُزوِ حیات بنانے پڑے ہیں وہ اشعارِ میر ہمیں

☆

پاس کیا ہے فقیروں نے بھی کبھی کبھار بہاروں کا
ورنہ خوش رہنا خوش رکھنا کام ہے دنیا داروں کا

پیر فقیر ، اوراد و وظائف اس بارے میں عاجز ہیں
ہجر و وصال کے باب میں اب تک حکم چلا ہے ستاروں کا

صبر و قرار تو وہم و گماں تھے ، ہوش و خرد افسانہ ہوئے
عشق کا نام نشان مٹائے کیسے کار گزاروں کا

دل ہی کے دم تک مر مر کر جینے کے سارے جھگڑے تھے
بارے قصّہ پاک ہؤا ہے ، جھوٹے سچے سہاروں کا !

☆

تیری لگن کے لاگ کے ہاتھوں ہم بے چین کمال ہوئے
جتنے ارماں جی میں رہے وہ اپنے جی کا وبال ہوئے

ہم تو خوش ہیں یہ دن آیا غیرؔ کے کہنے سننے سے
ان کو ہمارے، بارے میں بھی کیسے کیسے خیال ہوئے

آج کی بات نہیں ان حالوں ہم کو برسوں گزرے ہیں
جوں توں رات گزاری ، لیکن دن کو سوا بے حال ہوئے

شانِ خـــدا ہے آج زمانہ آیا ہم بے ہنروں کا !
ورنہ اس اک بستی میں بھی کیا کیا اہل کمال ہوئے

☆

اس کی شکایت کون کرے گا، دل کی وہ حالت گر نہ رہی
بارے تیرے تلوّن سے یکسانیٔ شام و سحر نہ رہی

اپنی طرح اس وحشت گاہ میں ہر عنوان سے رسوا ہے
جب سے فغانِ نیم شبی ممنونِ بابِ اثر نہ رہی

اونچی شاخ کا پھول بھی کیا اور قربت کی مخموری کیا
دور و قریب کی کوئی یاد بھی راحتِ دل بن کر نہ رہی

جیتے رہے تو ٹھانی ہے یہ نومیدانہ زیست کریں
اور کوئی تدبیر نہ تھی جو اب تک پیشِ نظر نہ رہی

کس برتے پر باتیں بنائیں یعنی شعر شعار کریں
رنگِ زمانہ دیکھ کے ہم کو ہمتِ عرضِ ہنر نہ رہی

☆

گلیاں وہ سنسان ہیں جن میں تیرا دوانہ پھرتا تھا
اُس کے بہانے دید کو تیری سارا زمانہ پھرتا تھا

ملکوں ملکوں شہروں شہروں ، اپنے غم کی شہرت تھی !
یوں در پردۂ محفل محفل ، تیرا فسانہ پھرتا تھا

جانبِ قبلہ ، کالی گھٹائیں ، یورش کر کر آتی تھیں
«آبِ حسرت آنکھوں میں اپنی نومیدانہ پھرتا تھا»

کیسے عمر کٹی کیا کہیے یاں ہرسانس بھی دُوبھر تھی
اور تسبیحِ روز و شب کا دانہ دانہ پھرتا تھا

صحرا صحرا اُٹھتے بگولے اُس کے نوحے کہتے ہیں
راتوں کو جو غزلیں پڑھتا ، مشتاقانہ پھرتا تھا

☆

نگری نگری ھجر و وصال کے کیسے کیسے جھمیلے تھے
سارے بناؤ بگاڑ میں لیکن دل زدگاں ھی اکیلے تھے

عہدِ جنوں سے پہلے کے مانوس مناظر خواب ھوئے
وہ آبادیاں صحرا تھیں ، وہ طُرفہ چمن ، بَن بیلے تھے

ناکامی کا ملال بھی ہم کو پیش رَووں کی سند سے ھے
ویسے اُن کی طرح سے ہم بھی ھار کا کھیل ھی کھیلے تھے

تیری رُوگردانی سے کیوں اپنا جینا دُوبھر ھے
آخر تیرے تغافل کے وہ ظُلم بھی ہم نے جھیلے تھے

ساحل پر کیا پہنچے ہم ، طومار سُنے ، ترکیبوں کے
پہلے یہ شکستہ کشتی تھی اور طوفانوں کے ریلے تھے

☆

رات کے بعد وہ صبح کہاں ہے دن کے بعد وہ شام کہاں
جو آشفتہ سری ہے مقدّر اس میں قیدِ مقام کہاں

بھیگی رات ہے ، سونی گھڑیاں اب وہ جلوۂ عام کہاں
بندھن توڑ کے جاؤں لیکن اے دل ، اے نا کام کہاں

اب وہ حسرتِ رسوا بن کر جزوِ حیات ہے برسوں سے
جس سے وحشت کرتے تھے تم ، اب وہ خیالِ خام کہاں

دل زدگاں کے دور سے پہلے دنیا رستی بستی تھی
پھر کچھ چرچے ایسے پھیلے چین کسے ، آرام کہاں

کرنی کرتے راہیں تکتے ہم نے عمر گنوائی ہے
خوبیِ قسمت ڈھونڈ کے ہاری ہم ایسے نا کام کہاں

اپنے حال کو جان کے ہم نے فقر کا دامن تھاما ہے
جن داموں یہ دنیا ملتی ، اتنے ہمارے دام کہاں

☆

کیا غمِ جاں اور کیا غمِ جاناں سب کے محرمِ راز ہوئے
اب مجبورِ نوا بھی نہیں ہیں اب تو پردۂ ساز ہوئے

خوئے فراق ہی آڑے آئی، آخر ہم مجبوروں کے
میل ملاپ پہ قادر جب سے آپ ایسے دَم باز ہوئے

لازم ہے درویشی کی خاطر، پردہ دنیا داری کا
ورنہ ہم تو فقیر ہیں جب سے یار زمانہ ساز ہوئے

شعر و سخن، سامانِ جنوں کیا، کوہکنی درویشی کیا
قیدِ حیات میں درد کے مارے رہے تو حیلہ ساز ہوئے

آج غزل کی صورت میں جو آپ کے سامنے آئے ہیں
کن جتنوں سے یہ خون کے قطرے اب تک پس انداز ہوئے

☆

تھی تو سہی ، پر آج سے پہلے ایسی حقیر فقیر نہ تھی
دل کی شرافت ، ذہن کی جودت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

سچ کہتے ہو ، ہم ایسے کہاں اور سوز و گدازِ شوق کہاں
سچ ہے مرے آئینۂ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی

اب جو اُچاٹ ہوئی ہے طبیعت ، شاید ہم اب رخصت ہیں
بِن کارن ، بے بات وگرنہ ، ایسی کبھی دل گیر نہ تھی

اہلِ جنوں کو فصلِ خزاں سے اب کے بھی گونہ ربط رہا
اب کہ بہار وہ آئی کہ جس کی بوئے گل بھی سفیر نہ تھی

آخر غیرتِ فہم نے سجھایا ، تو میدانہ زیست کریں
باقی ہر تدبیر نَو کی ، جو اپنے خلافِ ضمیر نہ تھی

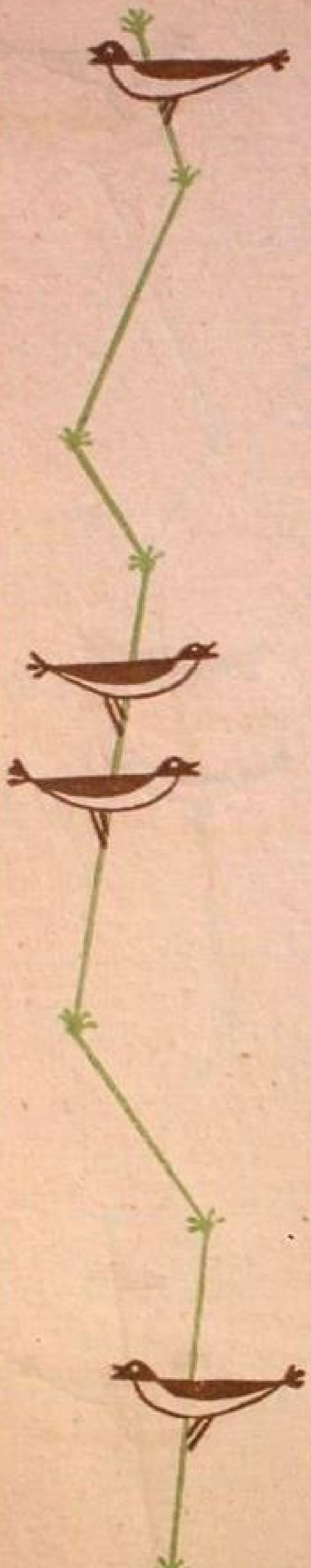

☆

بے کیفی کے پھیکے دنوں میں، کچھ بھی صبح و شام نہیں
کن جتنوں سے یہ ڈھونڈا سہارا ، ایسا حال مدام نہیں

یوں ملتے تھے ، جیسے ہمیں ہیں، ملنے کے قابل دنیا میں
یوں گزریں گے جیسے ، کسی سے کوئی سلام و پیام نہیں

یہ تسلیم ہے گاہے گاہے کچھ دلچسپی رہتی ہے
ورنہ تیری دنیا میں بھی ، کوئی ہمیں آرام نہیں

یارو اب شائستہ صحبت ، کون رہا اس بستی میں
اب صحبت درگیر نہ ہو تو ہم پہ کوئی الزام نہیں

☆

ایک سمے مسدود ہوئی تھیں ، ملنے کی جو راہیں تھیں
جن پہ کسی کا بس ہی نہ تھا ، وہ راہیں مری نگاہیں تھیں

صبر ان حالوں کس سے ہوا ہے ؟ پاسِ وضع ہی مانع تھا
لب پہ کسی کا نام تھا اور دل میں کسی کی چاہیں تھیں

ہر امید کے دامن میں بھی تیور تھے مایوسی کے !
ہم مجبوروں کو بھی میسّر ، کیسی کیسی پناہیں تھیں !

سچ کہتے ہیں منزل والے ، ہم میں گدازِ شوق نہ تھا
سچ ہے اُنہی کے اشک تھے موتی اُن کی آہیں تھیں

اب کچھ بھی نہیں ہیں ، یعنی آکر درویشوں میں بیٹھے ہیں
دن وہ تھے جب اپنے بھی سر پر ٹیڑھی ترچھی کلاہیں تھیں

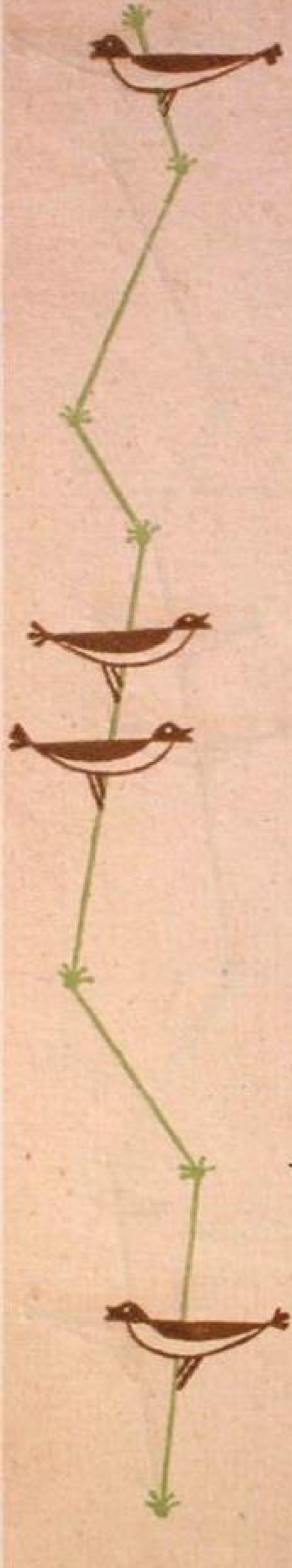

☆

ایک سمے محرومیٔ دل کے شاملِ حال ، دعا بھی نہ تھی
مر جاتے کچھ چین ھی ملتا ، ایسی رضائے خدا بھی نہ تھی !

پھول کلی کے رنگ و بو کی رسم و راہ ذرا بھی نہ تھی
کیسی بہار تھی یارو یہ تو پائے خزاں کی حنا بھی نہ تھی !

کونسی بات تھی لیلیٰ رُخوں میں، مرتے تھے جس پہ مجنوں لوگ
اوروں کے لئے تو کوئی ان میں ، ایسی ماہ لقا بھی نہ تھی

تیرے گریز و عتاب کے تیور ، سارے دیکھے بھالے ھیں
اس مفہومِ نگہ سے ھیں لرزاں ، آج جو ھم سے خفا بھی نہ تھی

آپ کے جبر و قدر کی باتیں ، اس ھستی کی بدولت ھیں
جو مجبور ازل ھی سے تھی ، اور راضی برضا بھی نہ تھی

☆

نکتہ وروں نے ہم کو سمجھایا ، خاص بنو اور عام رہو
محفل محفل صحبت رکھو ، دنیا میں گمنام رہو

یہ بھی کرامت ہوگی شاید ، اس افتادِ طبیعت کی
ورنہ دل سے کس نے کہا تھا ، یوں مغموم مدام رہو!

☆

وہ بھی دنیا ہوگی جس میں مانے اپنی پرائی دل
ہم مجبوروں پر تو کرے ہے کیسی کیسی خدائی دل

محفل محفل صحبت ہے تو عالم عالم وحشت ہے
تجھ سے کہاں تک کوئی نباہے اے دل اے ہرجائی دل

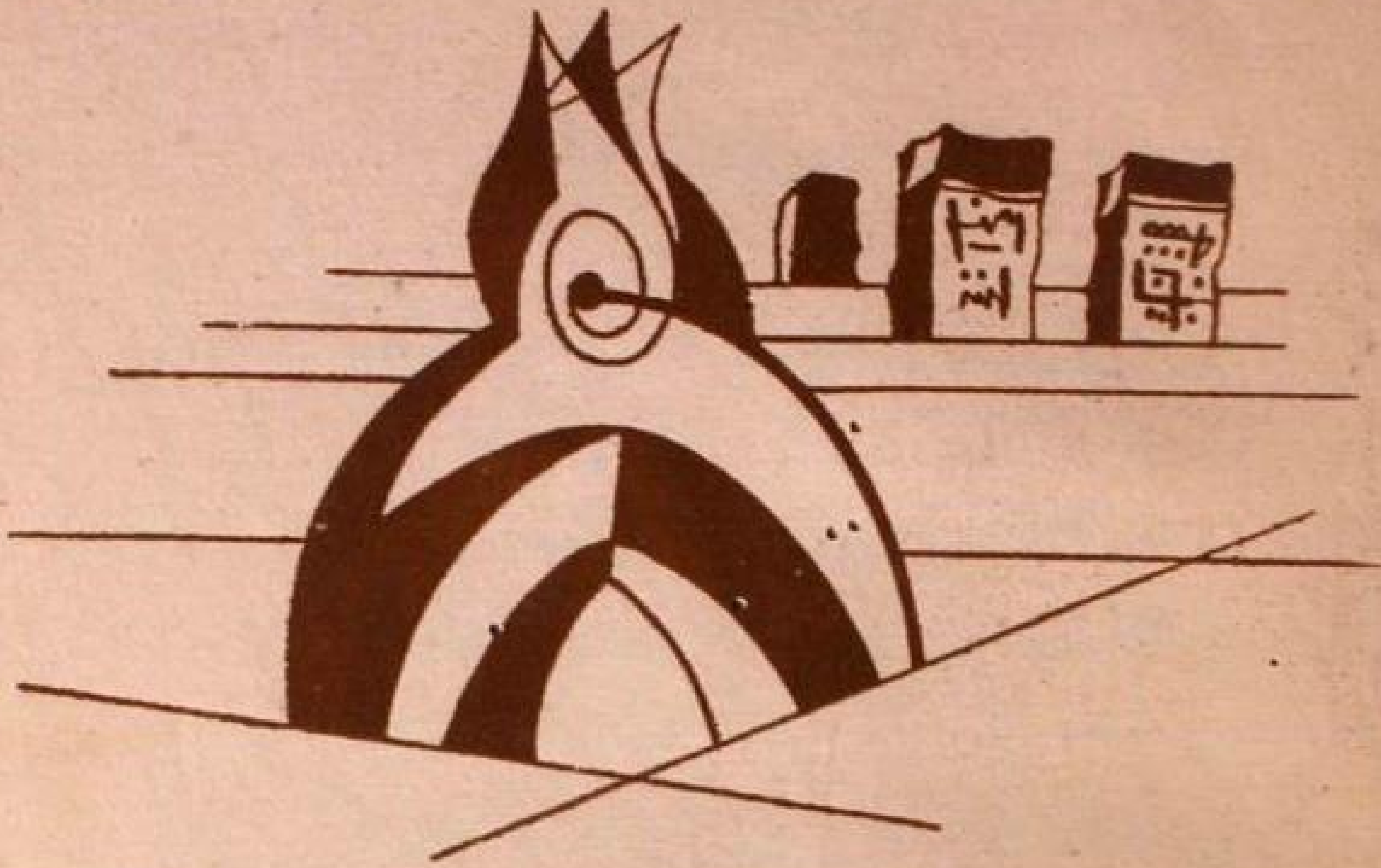

کیا خبر اِس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

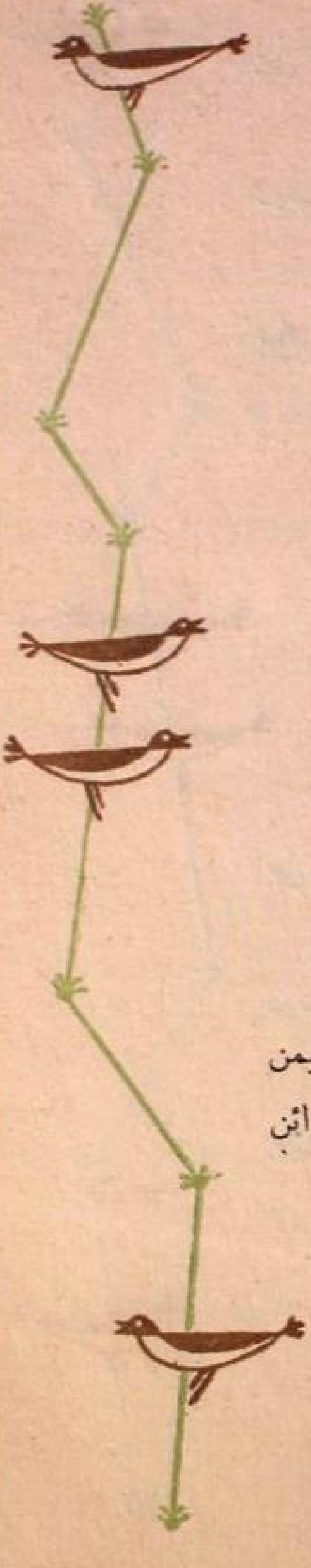

موہن جو ڈارو

اب وہ رُوحیں نہیں مٹّی کے گھروندوں کی اسیر
جن سے یہ ساحلِ دریا ، یہ زمینِ گل خیز
ہر ترقی کی شرف گاہ تھی ، تہذیب کا گہوارہ تھی ،
آج ٹیلوں کی کھلی گود میں یہ دیواریں
اپنے معدوم در و بام پہ ہیں نوحہ کناں
اپنے معدوم شرف کی ہیں حدیثِ خاموش ،

مگر یہ ویرانیوں کے مامن
یہ لہلہاتی ہوئی ہری کھیتیوں کی گودی میں
آندھی بربادیوں کے مسکن

یہ پاستاں کے خلائے وحشی میں اوجِ تہذیب کے نشیمن
مرے وطن کی پرانی عظمت کے یہ ہیں ، اُجڑے ہوئے مدائن

صبحِ ہستی کا یہ قصّہ ہے کہ یہ ویرانے
اب جو شمشان ہیں ، جب شہر تھے رستے بستے
سُونی گلیوں کا یہ انبار ، یہ حمّام ، یہ تال
کہتے ہیں ، اپنا مکیں کوئی کہیں ہو ، تو سنے

پہلی روح :— سنو ! یہ بھول بھلیّاں نہیں ، وحشت نہ کرو
آؤ ! یہ گھر تھا تمہارا جہاں تم پھولے پھلے
دوسری روح :— خاک بھی سرمۂ اکسیر ہے اس چوکھٹ کی
یہ وہ دانش گہِ مشہور ہے ، تم جس میں پڑھے
پہلی روح :— یہ ہے سلطانیِ جمہور کا ایوانِ عزیز
ہاں یہی ہیکلِ زہرہ ہے جبیں سب کی جُھکے

..

ھُو کے سنّاٹے میں کھو جاتی ہیں یہ آوازیں
ہلکے جھونکوں کی کراہوں سے لرزتی ہے فضا
کُو بکُو ، خاک بسر ، سسکیاں لیتی ہے صبا
ان ھجوکوں میں ابھرتی ہیں ، نئی فریادیں

پہلی روح :— شہر بربادی بھی کچھ حیلۂ آرام نہ تھی
ہم نہ یاں آئے ہوں ، ایسی تو کوئی شام نہ تھی
دوسری روح :— ہاں ہمیں ہیں یہ خزاں دیدہ ، نگوں سار نہال
خاک اور خشت کے ان پھیلے خرابوں کے امیں
پہلی روح :— اَن گنت صدیوں کے بے رحم تھپیڑوں کا وبال
ہم نے جھیلا ہے ، کہ دنیا ہمیں بھولے نہ کہیں

مگر — ہزاروں برس کی گمنامیوں کے پردے
اسی تمدّن کا اندھا مدفن بنے رہے ہیں
قرونِ اولیٰ ، قرونِ وسطیٰ ، قرونِ اُخریٰ کی

خونیں جنگوں میں ـــ
آشتی کی حسین گھڑیوں میں ـــ
عیش کے ہمہموں میں ـــ
اک دیدہ ور نہ نکلا !
جو ان ہزاروں برس کی گمنامیوں کے پردوں کو چاک کرتا
اور اس گراں مایہ ، گنجِ تہذیب تک پہنچتا !!

کس کو توفیق تھی ان ٹیلوں کا سینہ چیرے ؟
چیر کر دیکھے کہ اس مدفنِ پارینہ کی گہرائی میں
ایک تہذیب کے وہ کیا تھے نقوشِ باقی ؟
ایک تہذیب کے صنّاعوں کا ـــــــ
رہنے کا ، زندگی کرنے کا چلن کیسا تھا ؟
جی کو بہلانے کے حیلے کیا تھے ؟
طور خوشیوں کے ، غمی کے سرو سامان کیا تھے ؟
ان کے ہاں خالق و مخلوق میں ، کس رنگ کا ، کیا ناطہ تھا ؟

اسٹوپا :ـــ

اس نگری کا میں پہلا شوالہ ، ان ٹیلوں کا سرتاج بنا
بودھ دھرم ، آھنسا بانی ، جُگ جُگ مُکتی کاج بنا
جنم جنم کے بندھن ٹوٹے ، ہر پرانی کو پرکاش ملا !
کایا مایا کا سنکٹ چھوٹا ، دھرتی کو آکاش ملا

مرے بھکشو، مرے نروانی ، نگری نگری پھرنے والے
یاں آئے کہ ان کی بدولت جو چاہے سو مُکتی پالے
کایا ، مایا بندی خانے ، ان کے پھیر سے جان چھڑالے

•

عقیم صدیوں کی رہگزاروں میں ، زندگی باد پا رہی ہے
کنارِ دریائے سندھ لیکن ، یہ ٹیکری پر بلند معبد —
پچاس صدیوں کی باد پائی میں حَی و قائم !
ہزاروں نسلوں کی کور بینی، جمودِ غفلت کا گنگ شکوہ ستاں رہا ہے!

اور پھر تیس برس پہلے ، یہاں آیا تھا اک صاحبِ حال
جس نے یہ ٹیلے، عراق وعجمِ کہنہ کی تہذیب سے وابستہ کئے
جس نے ان ٹیلوں میں
ان پھیلے ہوئے تودوں میں ، اس مندر میں
ایک پارینہ تمدّن کے وہ مدفون نشاں دیکھ لئے !!

•

اور آثار کو کھودا گیا ، تحقیق ہوئی راہ نموں
علم کے عزم نے ان ٹیلوں کو شق کر ڈالا !
ان کی گمنامی کے آثار تجسس کی کدالوں سے چھٹے
اور اک شہر برآمد ہؤا !!

پچاس صدیوں کی جیسے ہم نے دنوں ہی میں کھینچ لیں طنابیں
اور اس شہر کی فصیلوں میں

پختہ کوچوں میں
صاف پکے گھروں میں
معبد کے مُکتی مٹھ میں —
یہاں کے لوگوں کے ٹوٹے، سرمہ ہوتے ڈھانچے بھی ہم نے پائے !!

پہلی روح :—
تم سوچتے ہو ، کیا آفت آئی ، شہر کا شہر جہاں سے گیا
اب اندازہ کرو تو جانیں ، کوئی کیسے جاں سے گیا

دوسری روح :—
تم سوچتے ہو، ہم لوگ جو یاں تہذیب کے صاحبِ عنواں تھے
وحشی لٹیرے، شاہ و گدا ، سب اپنے مال کے خواہاں تھے

پہلی روح —
تم سوچتے ہو ، دریا میں کہیں طوفانِ قیامت آئے ہوں گے !
زیست کے سب آثار اسی نے پل کے پل میں مٹائے ہوں گے !

جو بھی ہو ، موت کے چنگل سے کوئی چھوٹا ہے ؟
جاں چلی جاتی ہے ، رہ جاتی ہیں ، بے جاں چیزیں
رفتہ تہذیبوں کا بن جاتی ہیں ، عنواں «چیزیں» !!

ہماری آنکھوں نے، ان کی چیزوں ، میں علم و دانش کا نور پایا
ہماری آنکھوں نے ان کی چیزوں میں
تردماغی کا
چرب دستی کا اک انوکھا ظہُور پایا ،

ہم نے یاں حکمت و دانش کے دفینے پائے !
ہم نے ان چیزوں میں صدیوں کے قرینے پائے !
گوشِ دل کے لئے سب مائل تقریر بھی تھیں :

کُوزہ سازی :—

تمہارے سامنے تعمیر کی صورت خرابی ہے
خزف ریزے ہیں آئینہ ، کمالِ کُوزہ سازی کا
یہ ٹوٹے خُم منقش جام ، مینا ، آرتی تھالے
ضرورت میں بھی پَر تو ہے ، ہُنر کی دلنوازی کا

وادئ سندھ کے اس کُنج میں پتھر کا کوئی کام نہ تھا ؟

سنگ تراشی :—

حجابِ سنگ سے لیکن ہمیں وحشت نہیں ہوتی
ہمیں آتا ہے فن صُورت گری پیکر طرازی کا
یہ مٹی کے کھلونے، صنعتِ آذر کا نقشِ اولیں جانو
کہ ہر پیکر بنے آئینہ فن کی جاں گدازی کا !

ان کے ہاتھوں میں یہ گھونگھے ، یہ صدف موم ہوئے
سختئ عاج کی تہ میں گویا
گیلی مٹّی کی سی نرمی بھی ، لچک بھی تھی نہاں !

کیا عقیقِ یمنی ، سنگِ سلیمانی ، و یشپ و زر و سیم
ان ہنر مندوں کی صناعی سے کیا کیا نہ بنے
ناز نینوں کی سجل گردنیں ، مہتاب سی پیشانیاں ، سیمیں باھیں
پیارے کانوں کی وہ ننھی سی لَویں
برگِ گلِ تر کے سے نازک نتھنے
نقرئی ساعدیں ، بِلّوریں سے پا ۔ پنجۂ مرجاں کے سے ھاتھ
کسی تزئین ، کسی زیور کے نہ محتاج رہے ۔ !!

•

گھروں کی آسودگی کے ساماں میں زندگی کا جمود بھی ھے
گھروں سے باھر ھے پھیلی دھرتی
وسیع دنیا کے اَن گنت ، بے کراں تقاضے
گھروں سے باھر ھیں کشت و خرمن
گھروں سے باھر ھی رزم گاھوں کے خوں فشاں ، بے اماں تقاضے !!

•

فنِ حرب :—

تلوار کے جوھر میں ھے کندن کی صفائی
زھراب کا جرعہ ھے مسِ ناب کا پانی
نیزوں کی انی موت کے اژدر کی زباں ھے
خنجر کی اُپی دھار میں پانی کی روانی
سوفار کی نوکیں ھیں ، کہ سامان بلا ھیں
تیزی میں نگہ ان کی اڑانوں کی ھے ثانی

تانبے ، کانسی سے بنانے کی ہر اک چیز بنی
یہی دھاتیں ہیں کہ جو کھیت میں ، میدانِ وغا میں ، گھر میں ،
مرنے جینے کے قرینوں میں
بہر طور تھیں ان کی ساتھی

•

ہر اک تمدّن میں ، سازو سامانِ عیش ، کھیلیں
فنون و حرفت کے ساتھ ہی ساتھ..
تھکے جسموں کی ، ماندہ رُوحوں کی
فرحت و تازگی کی جاں ہیں !

گوئے چوگاں بھی یہاں ، چوسر و شطرنج یہاں
کعبتین ایسے ، کہ ہے مات قمارِ امروز
شغل بے باک جوانوں کا ، درندوں کا شکار
مسندِ میکدہ پر ، رقص و مے و نغمہ کا جشنِ نوروز

•

ہماری آنکھوں کو عیدِ نظارہ ، اس کامنی کا پیکر
یہ رقص کا بے مثال مظہر
چمکتے تانبے میں ، جیسے نغموں کا لوچ رُک جائے !
زمانے بھر کے رسیلے جسموں کی میٹھی ، مخمور تابنا کی
شباب و عشرت کی داستانوں کا بے اماں حُسن ،
خواب گوں کیف ، بانکا نشّہ
چمکتے تانبے کی ننھی مورت میں جیسے آسودہ ہوگیا ہو !

یہ کون تھی ؟ کوئی ناچ رانی
کہ دیوداسی ؟
یہ عہد رفتہ کی شعلہ آشام الفتوں کی حسین پیاسی !!

رقاصہ :—

جھن جھنن جھنن پھر باجے پائیلیا
چپ کا بندھن ٹوٹا
دور ہی دور سے دیکھنے والو ، دور کا ناطہ جھوٹا
جھن جھنن جھنن پھر باجے پائیلیا
چپ کا بندھن ٹوٹا
ہم اور تم میں جُگ جُگ کا اور جنم جنم کا ویوگ رہا ہے
کس نے کس کو یاد کیا ہے کس کو کس کا سوگ رہا ہے
پل کا ساتھ ہے اب بھی تم سے پل بیتا سنگ چھوٹا
جھن جھنن جھنن پھر باجے پائیلیا
چپ کا بندھن ٹوٹا
دور ہی دور سے دیکھنے والو
دور کا ناطہ جھوٹا
نگر نگر سے آنے والو ، یہ بستی بھی کبھی بستی تھی
پھر اُجڑی تو ایسی کہ تباہی ، جیون رس کو ترستی تھی
اب بھی وہی ویرانی ہے ، لیکن چپ کا بندھن ٹوٹا
جھن جھنن جھنن پھر باجے پائیلیا ، چپ کا بندھن ٹوٹا

دور ہی دور سے دیکھنے والو
دور کا ناطہ جھوٹا

اب یہ روحیں نہیں، ان پھیلے گھروندوں کی اسیر
جن سے یہ وادیٔ شاداب؛ تمدّن کی شرف گاہ رہی
یہ تمدّن بھی، نہاں خانۂ ماضیٔ کا نہیں زندانی
عصرِ حاضر کی یہ میراث ہے..
اب میرے وطن کی میراث!!

ہمیں ہیں اس کے حقیقی وارث کہ ہم نے پائے ہیں
اپنی آنکھوں سے بھی لگائے ہیں، یہ گمشدہ خزائن
وطن کی پارینہ عظمتوں کے
یہ ارضِ مشرق کے
نوعِ انساں کے اولیں اوج کے مدائن!!

ٹھـــٹھــہ

پہـــلا تـابلو :ـــ

اب مرے سامنے راہیں ہیں غبار آلودہ
جن کے ہر موڑ ـــ ہر اک خم میں یہ ویران آثار
مرگِ سلطانی کے یہ خستہ صنادید ـــ یہ بے جاں آثار
اپنے معدوم ہوئے جانے میں ہیں آسودہ

اور ٹیلوں پہ ، نشیمن میں یہ مردہ راہیں
بے نشاں قبروں کی یہ خاکِ فسردہ راہیں
گنبدوں ، روضوں کے کھنڈروں پہ یہ فریاد کناں سر بگریباں راہیں
کوشک و قصر کے ان پھیلے خرابوں میں یہ پیچاں راہیں !
سُونی مسجد کے قدم لیتی ہوئی ـــ سجدۂ دائم میں جُھکی یہ راہیں !
اور ہر سایۂ دیوار و در و بام سے کتراتی ہوئی یہ راہیں

سینکڑوں صدیوں سے اب جادۂ منزل بھی نہیں یہ راہیں !
کاروانوں کی تمناؤں کا حاصل بھی نہیں یہ راہیں !
اب غمِ راحلہ و زاد میں شامل بھی نہیں یہ راہیں !
دشت و آبادی میں اب عرصۂ حائل بھی نہیں یہ راہیں !

دوسرا تابلو :—

گنگ ہے سازِ ازل ، مرگِ ابد ہے طاری
دن ہیں دوبھر تو سرِ شام سے راتیں بھاری
نوبتِ بُوم سے ہر گنبدِ ویراں گونجے
جھولتے جالوں سے ہر سقف کی پردہ داری
خاک میں لتھڑی ہوئی زرد پتاور ہر سُو
کب سے ہیں لالہ و گل سے یہ زمینیں عاری
اور ..... یہ صدیوں کی ماری ہوئی وحشت گاہیں
کہتی ہیں : « قائم و قیوم ، جنابِ باری :

نہ یہ فنا ہے نہ یہ بقا ہے
میانِ بود و عدم یہ کیسا طویل وقفہ ہے
جو نوشتہ ہماری قسمت کا بن گیا ہے ؟
کنارِ دریا کبھی یہ بستی تھی —
لیکن اب نیستی و ہستی کے درمیاں اک مقامِ برزخ ہے
ایسا برزخ کہ جس میں صدیوں سے کاخ و کو ، بام و در ، مسلسل
شکستگی ، خستگی ، خرابی میں خیرہ سر ہیں !

حدودِ ہستی سے ہم نکل کر کھنڈر بنے تھے
مگر کھنڈر بن کے مٹ بھی جاتے

که یه غمِ زندگی کے رسیا
ہماری ہستی کو اپنی یادوں سے محو کر دیتے، بھول جاتے!
نہ یہ کہ ہم کو تماشہ گاہِ جہاں بناتے
ہمارے عبرت کدوں کو محفوظ کر کے رکھتے
نہ یہ کہ آبادیوں کی خاطر
ہماری بربادیوں کو «تاریخی یاد گاریں» بنائے رکھتے
وہ «یاد گاریں»
جہاں پہ یہ لوگ ..... زندگی کے اجارہ دار، آسکیں تو آئیں
دنوں کو راہوں کی خاک اڑائیں
وہ بارگاہیں جو عرش پایہ تھیں داب و آدابِ خسروی میں
وہاں یہ درّانہ گھستے جائیں
جہاں بھی جی چاہے اپنا نام اور شعر لکھیں
مچائیں غوغا، رکیک، بے معنی گیت گائیں
مگر نہ اوقاتِ پنج گانہ میں
ایک بھی وقت سُونی مسجد میں جھانک پائیں
کسی کی تُربت پہ فاتحہ کے لئے نہ یہ اپنے ہاتھ اٹھائیں
دنوں کو یونہی فسردہ راہوں کی خاک اڑائیں
دیئے جلے پر گھروں کو جائیں
ہماری ویرانیوں کو ویران تر بنا کر چلے ہی جائیں!!
یہاں پہ چھا جائے اندھی اندھیاریوں کا پھر وہ سکوتِ جامد
کہ بوم و شپّر ہی جس کے ہم راز و ہم نفس ہیں!

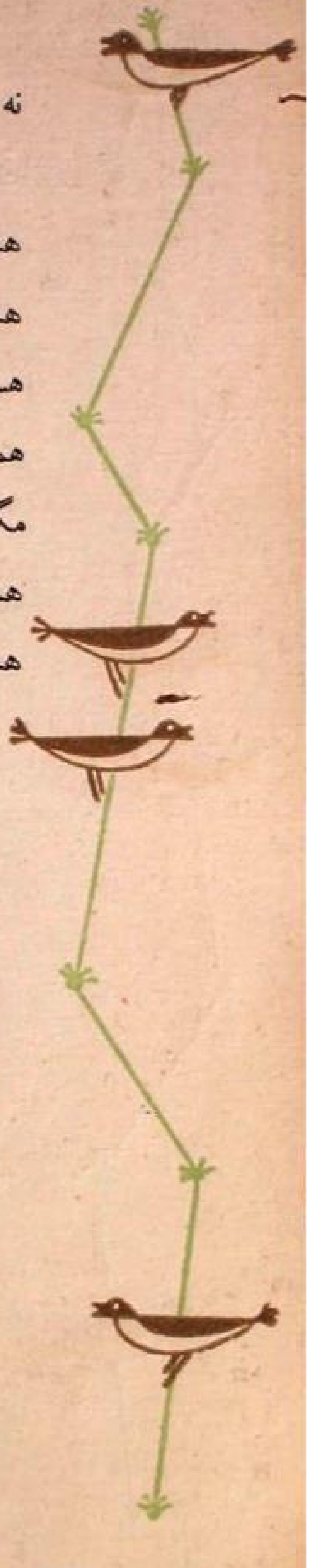

نہ دن کی وحشت میں کچھ کمی تھی
که شب کی دهشت میں کچھ کسر ہو !
ہمارے دن رات ایک سے ہیں
ہمارے دن رات اسی وجود و عدم کے اک وقفۂ مسلسل میں
ہستی و نیستی کے برزخ میں پا بہ گِل ہیں !
ہمارے دن رات اسی ورائے زمان وقفے سے مُتصل ہیں !
مگر ہمیں کب ملے گی اس دام سے رہائی ؟
ہمیں ملے گا عدم کی معدوم و بے نشاں گود کا سکونِ ابد خدایا؟
ہمیں ازل اور ابد کے چکر سے کب عطا ہوگی رُستگاری ؟
خدائے قیّوم و حیّ و قائم
جنابِ باری !!»

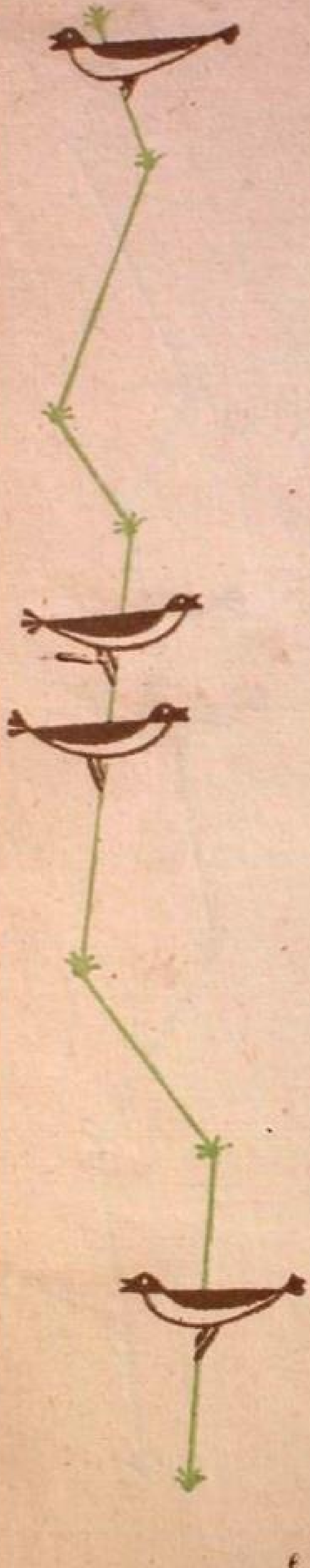

تیسرا تابلو:—

ہے کبھی عرصۂ آفاق ، نشانِ منزل
اور رہِ شوق سے منزل ہی گریزاں ہے کبھی
عین ہستی ہے کبھی ، بابِ فنا کا آغاز
زندگانی کی نمو، موت کا ساماں ہے کبھی
زندگی اپنے غموں سے کبھی یکسر ہی نڈھال
زندگی انجمن آرا و غزل خواں ہے کبھی
مردے زندوں میں کبھی زندہ بدستِ مردہ
شہر کے پیشِ نظر ، شہرِ خموشاں ہے کبھی

شام آتی ہے کہ شب ہو تو سحر ہوجائے
سمجھی جاتی ہے یہی عنایتِ تقدیر یہاں
بستیاں بستی رہیں ، مٹتے کھنڈر مٹ نہ سکیں
بس یہیں تک ہے خداوندئ تدبیر یہاں
اور ان کھنڈروں میں ہر گام پہ ہیں ، خاک میں خاک
ناوک انداز کے پہلو ہی میں نخچیر یہاں
کہیں معدوم سی قبروں میں ، کہیں روضوں میں
شیر افگن کے ہیں ہم خاک جہاں گیر یہاں
فرشِ مسجد میں ہیں آمیز جبینیں ان کی
جن کے آبا نے کہی اوّلیں تکبیر یہاں

گوشِ دل کے لئے ہے سُونی فضا میں محفوظ
عُود کا نغمہ یہاں ، چنگ کی تقریر یہاں
چشمِ بینا کے لئے ہے اسی وحشت کدہ میں
اک تمدّن کے ، ثقافت کے اساطیر یہاں

پھر مرے سامنے آتی ہیں وہ پھیلی راہیں
جو یہ کہتی ہیں کہ « راہوں ہی سے نکلی راہیں »
جرسِ گل پہ رواں قافلۂ موسمِ گل
ہر خزاں ڈھونڈتی پھرتی ہے اسی کی راہیں
« زندگی انجمن آرا و نگہبانِ خود است »
اپنے حیلوں ہی سے ہیں موت کی لُٹتی راہیں
راہیں ، منزل تو نہیں ہیں کہ اجڑ کر نہ بسیں
زیست کی طرح سنورتی ہی رہیں گی راہیں !
« باز بر رفتہ و آئندہ نظر باید کرد
ہلے ! برخیز کہ اندیشہ دگر باید کرد »